(العلم و الخشيّة)

(علم اور خوفِ خدا)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	ضرورتِ بیان	۹
۲	رفع اشکال	۱۰
۳	علم کا درجہ مطلوب	۱۱
۴	طریقِ اصلاح	۱۲
۵	خطیب کا فائدہ	۱۲
۶	تعلق علم وخشیت	۱۴
۷	مفسدہ اہل علم	۱۶
۸	بنئے کا حساب	۱۷
۹	بغیر تحقق حد اوسط نتیجہ نہیں نکلتا	۱۸
۱۰	فرق آمد و آورد	۱۹
۱۱	کلام کا اثر	۲۰
۱۲	نرا دعویٰ کافی نہیں	۲۰

۱۳	حقیقی خشیت کا اثر	۲۱
۱۴	قلب کا اثر	۲۲
۱۵	بے دینوں کے کتب کے مطالعہ سے احتراز	۲۳
۱۶	مطالعہ میں احتیاط	۲۴
۱۷	تقسیم موئے مبارک	۲۵
۱۸	قبر پرستی	۲۷
۱۹	حیات انبیاء	۲۸
۲۰	قبر کو سجدہ کی ممانعت	۲۸
۲۱	صحت کا فائدہ	۳۰
۲۲	تصور شیخ	۳۱
۲۳	تصور شیخ میں کی جانے والی کوتاہیاں	۳۲
۲۴	صفات الٰہی کا مظہر	۳۴
۲۵	تبرکات کی حقیقت	۳۵
۲۶	چاہنے کے علاوہ عمل ضروری ہے	۳۷
۲۷	خشیت کی علامت	۴۰
۲۸	علم کا درجہ مطلوب	۴۳

۲۹	علم اور عشق	۴۵
۳۰	علم مطلوب	۴۴
۳۱	فخر وفضیلت	۴٦
۳۲	خشیتِ مطلوبہ	۴۸
۳۳	حصول خشیت کی فرصت نہیں کا جواب	۴۹
۳۴	صرف کتابیں پڑھنے سے خشیت حاصل نہیں ہوگی	۴۹
۳۵	عوام کی تعلیم	۵۰
۳٦	ضرورت وعظ	۵۲
۳۷	دولت علم	۵۴
۳۸	تبلیغ کی صورت	۵۵
۳۹	چندہ اور علماء	۵۷
۴۰	علماء چندہ مانگنے سے احتراز کریں	۵۷
۴۱	حصول چندہ کے بارے میں حضرت کی رائے	۵۹
۴۲	تبلیغ کا قاعدہ	۵۹
۴۳	کام کرنے کا طریقہ	٦۰
۴۴	وعظ کہنے والوں کو نصیحت	٦۱

۴۵	علم مقصود کے حصول کا طریقہ	۶۲
۴۶	ایک علمی اشکال	۶۳
۴۷	علم کی قسمیں	۶۷
۴۸	رفع اشکال	۶۸
۴۹	خلاصہ کلام	۶۸
۵۰	خشیت کی ضرورت	۶۹

وعظ

(العلم و الخشیّۃ)

(علم اور خوف خدا)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے وعظ ''العلم والخشیۃ'' فضیلت علما اور خشیت خداوندی کے متعلق ۲۰ شعبان ۱۳۴۱ھ بروز یک شنبہ بوقت صبح مدرسہ عبدالرب دہلی میں کھڑے ہوکر فرمایا جو تین گھنٹوں میں ختم ہوا۔ سات سو کے قریب حاضری تھی۔ اسے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قلم بند فرمایا۔

وعظ میں حقیقت علم وخشیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''علم وہی ہے جو خدا کا راستہ دکھائے دل سے گمراہی کا زنگ دور کرے اور حرص و ہوا سے چھڑا کر دل میں خوف وخشیت پیدا کردے۔ نیز علم عمل کے لئے مقصود ہے۔ خواہ عمل بالجوارح ہو یا بالقلب۔ اور کوئی طریق بدوں ترتب مقصود کے کامل نہیں ہوتا۔ پس بدوں عمل کے علم بھی کامل نہ ہوگا ناقص ہوگا''

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس نعمت سے نوازے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۵/اپریل ۲۰۱۳ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارک وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُاط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴾(۱)

''اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرا کرتے ہیں۔ بلاشک اللہ تعالیٰ زبردست بہت بخشنے والا ہے''

ضرورت بیان

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔علم وخشیت کا باہمی تعلق کچھ مخفی نہیں (۲) بلکہ ایسا ظاہر تعلق ہے کہ عام زبانوں پر اولاً اس کا دعوی بھی آتا ہے۔ پھر استدلال (۳) میں یہی آیت پڑھ بھی دی جاتی ہے۔جس کو قرآن وحدیث سے کچھ بھی مناسبت ہے وہ اس تعلق سے غافل نہیں اس کا مقتضا(۴) یہ تھا کہ پھر اس کو بیان ہی نہ کیا جاتا اور شاید اس وقت کے بیان کو تحصیل حاصل ہی(۵) سمجھا جاوے کہ یہ تو ظاہر مضمون

(۱) سورۂ فاطر: ۲۸ (۲) علم اور خوف خداوندی کا باہمی تعلق کسی پر پوشیدہ نہیں (۳) بطور دلیل (۴) تقاضا (۵) اس چیز کو حاصل کرنے کی فکر جو پہلے سے حاصل ہے۔

ہے جو سب کو معلوم ہے مگر میں اس کی ضرورت ابھی واضح کیے دیتا ہوں۔

اول تو اگر فرض کرلیا کہ یہ تعلق معلوم ہے تب بھی بیان کو تحصیل حاصل نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بیان سے تاکید اور زیادت استحضار مقصود ہو (۱) اور تاکید بھی خود مستقل جادید سے ہے لیکن ابھی تو اسی میں کلام ہے کہ اس تعلق کا جیسا علم ہونا چاہیئے وہ ہے بھی یا نہیں۔

سو بات یہ ہے کہ عام طور پر اس تعلق کا پورے طور سے علم ہی نہیں۔ اور گو کہنا ہے تو بے ادبی مگر چونکہ اس وقت معاملہ کی گفتگو ہے اس لیے صاف صاف کہا جاتا ہے کہ عوام تو عوام ہم جیسے لکھے پڑھے بھی جو اہل علم کہلاتے ہیں ان کو بھی اس تعلق کا پورا علم نہیں اور علم ہے بھی تو اس کے مقتضٰی پر عمل نہیں۔ جب عمل ہی نہیں تو علم بھی ناقص ہوا۔

کیونکہ علم عمل ہی کے لئے مقصود ہے خواہ عمل بالجوارح ہو یا بالقلب (۲) اور کوئی طریق بدوں ترتب مقصود کامل نہیں ہوتا (۳)۔ پس بدوں عمل کے علم بھی کامل نہیں ہوگا پس اگر علم کو ایک حیثیت سے یعنی حصول کی حیثیت سے کامل بھی مان لیا جائے تو وہ اس دوسری حیثیت سے ناقص ہے کہ اس پر عمل جو کہ مقصود ہے، نہیں ہے (۴)۔

رفع اشکال

یہاں سے ایک شبہ بھی رفع ہوگیا جو اس تقریر کے بعض اجزاء پر ابتداءً وارد ہوا ہوگا۔ وہ یہ کہ میں نے کہا ہے کہ علم عمل کے لئے مقصود ہے۔ اس پر یہ شبہ ہوتا

(۱) بیان سے مقصود تاکید کرنا یا اس مضمون کو ذہن میں حاضر کرنا ہو (۲) چاہے اعضاء کا عمل ہو یا دل کا (۳) کوئی طریقہ اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اس پر مقصود مرتب نہ ہو۔

ہے کہ بعض اجزاء اخیرہ سے یہ شبہ رفع ہو گیا۔

حاصل جواب کا یہ ہے کہ علم کو عام رکھا جائے تو بے شک بعض علوم فی نفسہا مقصود ہیں اور اگر علم سے مراد کامل علم مقصود ہو تو اب کوئی علم محض درجہ علم میں مطلوب نہیں۔ بلکہ ہر علم سے عمل بھی مطلوب ہے اور میرے کلام میں عمل سے معنی عام مراد ہیں خواہ عمل جوارح ہو یا عمل قلب تو اب اس دعوے پر کوئی شبہ نہیں کیونکہ علم نام ہے اعتقاد جازم کا۔

علم کا درجہ مطلوب

اور تجربہ ہے کہ جزم جس درجہ کا شرع میں مقصود ہے بدوں عمل بالمقتضی (۱) کے نہیں حاصل ہوتا۔ اگر تم ایک علم حاصل کرو اور اس کا اجراء نہ کرو۔ اس پر عمل ممارست (۲) نہ کرو تو یقیناً علم ناقص رہے گا۔ (جیسے طبیب طب پڑھ کر مطب نہ کرے یا باورچی کھانے کی ترکیبیں معلوم کر کے پکانے میں مشغول نہ ہو تو یہ علم کسی کام کا نہ رہے گا۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں ہیں ۱۲)

حتی کہ عقائد محضہ (۳) توحید وغیرہ بھی جب تک کہ ان کے مقتضاء پر عمل نہ ہو درجہ حال میں نہیں پہنچتے اور درجۂ کمال اعتقاد کا وہی حال کا درجہ ہے۔

پس جو لوگ اپنے کو علم سے متصف سمجھتے ہیں وہ بھی اس کوتاہی میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے اپنے علم کے مقتضا پر عمل نہیں کیا تو وہ بھی اس تعلق سے غافل ہیں۔ مگر سب ایسے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کو خاص سمجھتے ہیں اور واقع میں وہ خاص نہیں ہیں (بلکہ بمعنیٰ دیگر خواص ہیں) کیونکہ عامی اور خاصی امور

(۱) اس کے مقتضی پر عمل کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا (۲) عملی طور پر اس کو اختیار نہ کرو (۳) حتی کہ وہ باتیں جن کا تعلق صرف عقیدہ سے ہے۔

اضافیہ ہیں۔ جو اپنے کو خاص سمجھتے ہیں خاص کامل کے اعتبار سے وہ بھی عامی ہی ہیں۔ پس اس وقت کے بیان میں تحصیل غیر حاصل ہے مگر ترکیب توصیفی کے ساتھ نہیں بلکہ ترکیب اضافت کے ساتھ۔ بہرحال اس بیان کی ضرورت ثابت ہوگئی۔

طریق اصلاح

رہا یہ کہ جو لوگ واقع میں خواص ہیں ان کی نسبت سے تو یہ بیان تحصیل حاصل ہی رہا۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ میرے مخاطب نہیں ہیں بلکہ میں خود ان کا محتاج ہوں کہ وہ مجھے طریقۂ اصلاح ارشاد کریں۔ باقی جن کے لئے یہ بیان ہورہا ہے جو میرے مخاطب ہیں ان کے لئے تو یہ تحصیل غیر حاصل ہے(۱) جن میں میں خود بھی داخل ہوں۔ میں اپنے کو بھی اس بیان کا مخاطب کرتا ہوں جیسے قرآن میں ایک مومن کے قول کی حکایت کی گئی ہے۔

﴿ وَمَالِيَ لَآ اَعۡبُدُ الَّذِيۡ فَطَرَنِيۡ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ﴾ (یٰسین:۲۲)

یعنی اور میرے پاس کون سا عذر ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے اور تم سب کو اس کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

جس میں اس نے امر توحید کا اپنے کو بھی مخاطب کیا ہے وہ یہ بھی رفع ہوگیا کہ اپنے کو مخاطب کرنا کیسا کیونکہ اس کی نظیر قرآن میں موجود ہے۔

خطیب کا فائدہ

دوسرے اس کی بابت میں ایک حقیقت بیان کرتا ہوں جب مجھے کسی عمل میں کم ہمتی ہوتی ہے تو میں اس کے متعلق مجمع عام میں ایک عام مضمون بیان کر دیتا ہوں۔ اس سے خود میری ہمت بھی قوی ہوجاتی ہے اس میں راز یہ ہے کہ جس عمل

(۱) یہ ایک ایسی چیز کو حاصل کرنا ہے جو پہلے سے حاصل نہیں ہے۔

کے متعلق عام بیان ہوتا ہے تو قاعدہ ہے کہ بیان میں اس کا پورا اہتمام واعتناء ہوتا ہے۔ مخاطبین پر اچھی طرح اس کی ضرورت ظاہر کی جاتی ہے تو طبعاً۔ متکلم کے دل میں اس سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ جس بات کا ہم دوسروں کو تاکید کے ساتھ امر کررہے ہیں(۱)۔ سب سے پہلے خود بھی اس پر عمل کرنا چاہیئے اس سے فی الجملہ ہمت(۲) بڑھتی ہے۔ پھر مخاطبین میں کوئی بزرگ اور نیک آدمی بھی ہوتا ہے۔ اگر بیان سے اس کا دل خوش ہوگیا اور اس نے دل سے دعا دے دی اور وہ قبول ہوگئی یا کسی کو اس بیان سے نفع ہوگیا۔ اور اس طور پر بیان کرنے والا ہدایت کا سبب ہوگیا جو ایک بڑی طاعت ہے تو اس پر خدا تعالیٰ متکلم کے ساتھ بھی رحمت کا معاملہ فرمادیتے ہیں کہ اس نے ہمارے بندوں کو ہماری طرف متوجہ کیا ہے تو اس کو بھی محروم نہ رکھا جائے یہ سب اسباب خود واعظ کو نفع حاصل ہوجانے کے ہوجاتے ہیں۔

غرض میں خود تو بیان کردینے کو اپنے لئے بھی ایک مفید طریق اصلاح سمجھتا ہوں اس سے مجھے خود بھی بہت نفع ہوتا ہے اسی لیے میں نے کہا ہے کہ میں اپنے کو بھی اس بیان کا خطاب کرتا ہوں۔ یہ بات میں نے اس لیئے بیان کردی تاکہ دوسرے بھی اس طریق اصلاح سے کام لیں کہ جس عمل کی ان کو ہمت نہ ہوتی ہو اس کے متعلق مجمع عام میں کچھ بیان کردیا کریں تجربہ کرکے دیکھیں ان شاء اللہ ضرور ہمت پیدا ہوجائے گی۔

غرض تحصیل حاصل کا شبہ جاتا رہا اور ضرورت بیان متحقق ہوگئی گو سب مخاطبین کے لیے نہ ہو۔ بعض ہی کے اعتبار سے ہو اور اگر فرضا(۳) کسی کو بھی ضرورت نہ ہو تو میں خود اپنی اصلاح کے لئے اس کی ضرورت سمجھتا ہوں۔

(۱) حکم دے رہے ہیں (۲) کچھ نہ کچھ ہمت پیدا ہوتی ہے (۳) بالفرض اگر کسی کو بھی ضرورت نہ ہو۔

تعلق علم وخشیت

اب سنیئے کہ یوں تو خشیت اور علم میں تعلق سبھی جانتے ہیں چنانچہ اکثر مواقع میں لوگ اس آیت کو خشیت وعلم میں تعلق ظاہر کرنے کے لئے پڑھ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک موقعہ تو اس کے پڑھنے کا یہ ہوتا ہے کہ کسی کو علم کی فضیلت وتاکید کا بیان کرنا مقصود ہے اور لوگوں کو تحصیل علم کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ وہاں اس آیت سے علم کی ضرورت وفضیلت کی اس طرح تقریر کرتے ہیں کہ علم وہ شے ہے جس سے خشیت خداوندی حاصل ہوتی ہے اور خشیت ضروری ہے کیونکہ جابجا قرآن میں اس کا امر ہے (۱)۔

﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو'' اور ﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ﴾ ''پس نہ ڈرو تم ان سے اور مجھ سے ڈرو''۔ نیز خوف وخشیت کا شرط ایمان ہونا احادیث میں مذکور ہے کہ الایمان بین الرجاء والخوف اور ضروری کے اسباب ضروری ہوتے ہیں تو علم کا حاصل کرنا ضروری ہوا۔

دوسرا موقعہ یہ ہوتا ہے کہ کسی نے کوئی کام بے باکی کا کیا ہو تو اس وقت پڑھ دیتے ہیں ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ کہ بھائی خدا سے تو اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص علم سے محروم تھا۔ اسی لئے اس نے یہ کام کیا۔ اگر اس کو علم ہوتا تو کبھی ایسی بے باکی اور جرأت نہ کرتا۔

صورت اول میں مدلول بعبارۃ النص ضرورت وفضیلت علم کی ہے (۲) اور صورت ثانیہ میں مدلول بعبارۃ النص بے باکی اور جراءت علی المعاصی کی لم بیان کرنا ہے (۳)

(۱) حکم ہے (۲) پہلی صورت میں قرآن کی آیت کے الفاظ سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے دوسری صورت میں الفاظ قرآنی کا مقصد گناہوں پر بے باکی وجرأت کی وجہ بیان کرنا ہے۔

مگر دلالۃً اس سے علم کی فضیلت بھی لازم آ گئی۔ کیونکہ جب عدم علم کو جرأت علی المعاصی کی لم کہا تو علم کو ترک معاصی کا سبب مان لیا(۱)۔ اور ترک معصیت ضروری ہے تو اس کا سبب بھی ضروری ہوا(۲)۔ اور ضرورت شرعی میں فضیلت لازم ہے جس درجہ کی ضرورت ہوگی اسی درجہ کی فضیلت بھی ضروری ہوگی مثلاً فرض واجب سے زیادہ ضروری ہے تو وہ واجب سے افضل۔

اسی طرح واجب سنت سے اور سنت مستحب سے افضل ہے تو جب علم کا ضروری ہونا تسلیم کرلیا گیا کیونکہ اس کا نہ ہونا جرأت و بے باکی کا سبب ہے تو اس کی فضیلت بھی تسلیم ہوگئی۔ بہر حال دونوں موقعوں میں اس آیت کے پڑھنے سے فضیلت علم کی ثابت کی جاتی ہے ایک جگہ صراحۃً اور ایک جگہ دلالۃً۔

غرض علم اور خشیت کے تعلق کا علم تو سب کو ہے مگر جیسا علم ہونا چاہیئے ویسا نہیں ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اس علم بالتعلق کے ثمرات لازمہ (۳) ظاہر نہیں ہوتے بلکہ برعکس ثمرات (۴) ظاہر ہورہے ہیں اور شئے کا تحقق وعدم تحقق اس کے خواص لازمہ سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ اگر ایک جگہ کسی شے کے خواص لازمہ موجود نہ ہوں تو شے کے عدم تحقق کا حکم کیا جائے گا۔ اسی قاعدہ سے یہاں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے اندر اس علم کے خواص وثمرات لازمہ موجود نہیں ہیں بلکہ برعکس ثمرات موجود ہیں۔

---

(۱) جب علم نہ ہونے کی وجہ سے گناہ کے صادر ہونے کو تسلیم کرلیا تو علم آنے کے بعد گناہ سے رکنا لازم ہے (۲) گناہ چھوڑنا ضروری تو اس کا سبب بھی ضروری (۳) اس تعلق سے جو نتیجہ نکلنا چاہیئے وہ نہیں نکلتا (۴) بلکہ نتیجہ اس کے برخلاف ظاہر ہوتا ہے۔

مفسدہ اہلِ علم

چنانچہ علم وخشیت میں تعلق معلوم کرکے آج کل دو مفسدے پیدا ہوئے ایک اہل علم میں، دوسرا اس فرقہ میں جو علماء پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔

اہل علم میں تو یہ مفسدہ پیدا ہوا کہ وہ اس آیت سے علم کی فضیلت ثابت کرکے رہ جاتے ہیں کہ دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علماء کی تعریف فرمائی ہے تو علم کی بڑی فضیلت ہے اور ہم کو علم حاصل ہے اس لیے ہم بھی صاحب فضیلت ہوئے مگر جو اصل منشاء اس فضیلت کا تھا یعنی خشیت اس کو بیان نہیں کرتے نہ تو دوسروں کو اس کا امر کرتے ہیں کہ خشیت حاصل کرو اور نہ خود اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں۔

چنانچہ بکثرت اہل ظاہر علم باطن کو جس سے خشیت حاصل ہوتی ہے فضول اور لغو سمجھتے ہیں اور جو لوگ اس کی تعلیم وتعلم میں مشغول ہیں ان پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ ستم یہ ہے کہ بعض تو عدم خشیت (۱) کی تعلیم دیتے ہیں گو اس کا عنوان دوسرا ہو مگر معنون یہی ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک زمانہ میں کفار کے ساتھ اتحاد کرکے جب مسلمانوں نے کفریات و معاصی (۲) کا ارتکاب کیا اور بعض لوگوں نے اس پر تنبیہ کی تو یہ جواب دیا گیا کہ یہ وقت مسائل حلال وحرام بیان کرنے کا نہیں ہے یہ وقت کام کرنے کا ہے۔ نہ معلوم۔ مسلمانوں کا کون سا کام ہے جس میں ان کو حلال وحرام معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس جواب میں گویا ان لوگوں نے قریب بصراحت مسلمانوں کو عدم خشیت کی تعلیم دی ہے (۳) تو جو چیز فضیلت علم کا منشا ہے یہ اسی کی

(۱) خوف خدا کے مٹانے کی (۲) کافرانہ عقائد اور گناہوں کا ارتکاب کیا (۳) صراحتاً خوف خدا کو ختم کرنے کی تعلیم دی۔

جڑ کاٹتے ہیں بس وہ مثال ہوگئی ؎

یکے برسر شاخ و بن مے برید خداوند بستاں نگاہ کرد و دید

''یعنی ایک شخص شاخ کے تنہ پر بیٹھا ہوا اس کی جڑ کاٹ رہا تھا۔ مالک باغ نے نگاہ ڈالی اور دیکھا''

خشیت کے ساتھ تو یہ معاملہ اور پھر بھی یہ خوش ہیں کہ ہم اہل علم ہیں جن کی بابت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾(۱) ''یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرا کرتے ہیں'' فرمایا ہے: بلکہ بعض نے اس کے ساتھ ایک مقدمہ اور ملا دیا ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّہٗ﴾ ''یہ اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے''

جس کا حاصل یہ ہوا کہ علماء صاحب خشیت ہیں اور صاحب خشیت کے لئے جنت و رضاء حق حاصل ہوتی ہے تو علم سے جنت و رضاء حاصل ہوتی ہے اب اس کی فضیلت کا کیا پوچھنا؟

بنئے کا حساب

صاحبو! یہ حساب تو واقعی درست ہے مگر پہلے اس حد اوسط(۲) کا تحقق تو ہونا چاہیئے جس سے مل کر یہ قیاس بنا ہے اور اگر یہ حد اوسط محض باتوں ہی باتوں میں ہے تو نتیجہ بھی باتوں میں ہی ہوگا واقع میں کچھ نہ ہوگا۔ اور اس صورت میں یہ ایسا اوسط ہوگا جیسا ایک بنیئے نے اوسط نکالا تھا کہ وہ ایک بیل گاڑی میں سوار ہو کر کنبہ سمیت جا رہا تھا۔ راستہ میں ندی آئی جس میں پانی بہت تھا۔ گاڑی بان نے اس میں گاڑی ڈالنے سے توقف(۳) کیا۔ یہ تو بنیئے نے کہا اچھا میں بانس سے پانی

(۱) سورۂ فاطر: ۲۸ (۲) منطق کی اصطلاح ہے۔ صغریٰ کبریٰ اور حد اوسط (۳) گاڑی چلانے والا ندی میں گاڑی چلانے سے بسبب پانی زیادہ ہونے کے کچھ ہچکچایا۔

ناپتا ہوں چنانچہ ندی کے کنارے پر دیکھا مثلاً ایک ہاتھ۔ پھر آگے دیکھا اور زیادہ ہے آگے ڈوبان ہے آپ نے سب کاغذ پر لکھ کر اوسط نکالا تو اوسط کمر تک نکلا آپ نے گاڑی بان کو حکم دیا کہ بس گاڑی ڈال دو ہم نے اوسط نکال لیا ہے گاڑی ڈوب نہیں سکتی۔ جب بیچ میں پہنچی اور گاڑی مع بیلوں کے ڈوبنے لگی تو بنیئے نے حساب کا کاغذ پھر دیکھا تو حساب صحیح تھا اب وہ کہتا ہے کہ لکھا جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں(۱)۔

اس بے وقوف سے کوئی پوچھے کہ تو نے جو بیچ کی گہرائی کو تمام اطراف میں تقسیم کر دیا تو کیا اس سے واقع میں بھی وہ تقسیم ہوگئی ہرگز نہیں۔ یہ تقسیم محض کاغذ تھی اور واقع میں جہاں جتنی گہرائی تھی وہ اپنے حال پر تھی۔ تمہارے اوسط نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھیئے کہ آپ نے جو اس حد اوسط سے نتیجہ نکالا ہے کہ علم سے خشیت حاصل ہوتی ہے اور خشیت سے جنت تو ہم جنتی ہوئے۔ تو یہ اوسط محض باتوں ہی میں ہے تو نتیجہ بھی باتوں میں ہوگا واقع میں نہ ہوگا۔

بغیر تحقق حد اوسط نتیجہ نہیں نکلتا

جیسے آپ کسی سے کہیں ان کنت امراۃ کنت حاملاً واذا کنت حاملاً تلدین (۲) تو کیا اس قیاس سے واقع میں بچہ پیدا ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ حد اوسط کا تحقق واقع میں نہیں ہوا۔

پس اس قیاس سے نتیجہ نکالنا ایسا ہی ہے جیسے ایک بنیئے کا نائب (جس کو عرف میں منیب منیم جی کہتے ہیں) دکان پر بیٹھا ہوا حساب کر رہا تھا کہ سو میں سے

(۱) یعنی حساب تو درست ہے کہ اوسطاً پانی کمر تک ہے پھر میرا خاندان کیوں ڈوب رہا ہے (۲) اگر تو عورت ہے تو حاملہ ہوگی اور جب حاملہ ہوگی بچہ جنے گی۔

ساٹھ گئے ہاتھ لگے چالیس اور ہزار میں سے سات سو گئے ہاتھ لگے تین سو۔ ایک فقیر بھی کھڑا ہوا یہ سن رہا تھا جب وہ حساب کر چکا تو فقیر نے سوال کیا اس نے کہا سائیں! میرے پاس کہاں۔ جب لالہ جی آویں گے ان سے مانگنا۔ فقیر نے کہا تم غلط کہتے ہو میں تو گھنٹہ بھر سے تمہیں بار بار یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں کہ ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگے اتنے۔ میں ان سب کو جوڑتا رہا تو تمہارے ہاتھ ہزاروں لگے ہیں پھر یہ کیسے کہتے ہو کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ منیب نے کہا، سائیں! یہ کاغذی ہاتھ تھا میرے ہاتھ تو ایک پیسہ بھی نہیں لگا۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جب تک حامل کا تحقق واقع میں نہ ہوگا اس وقت تک بچہ کا تحقق محض تصور کے درجہ میں ہوگا۔ یوں ہی جب تک خشیت کا تحقق نہ ہوگا ان مقدمات سے فضیلت علم محض باتوں ہی باتوں میں ہوگی۔

صاحبو! یہ حد اوسط پہلے متحقق ہونا چاہیئے یعنی واقع میں بھی تو خشیت ہو تب آپ کو واقع میں جنت مل سکتی ہے۔ ورنہ محض باتوں سے کیا ہوتا ہے کہیں باتوں سے بھی خشیت پیدا ہوئی ہے ؎

وجائزة دعوی المحبة فی الهوی　　ولکن لا یخفی کلام المنافق

''عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے لیکن منافق کا کلام پوشیدہ نہیں رہتا''

فرق آمد و آورد

اگر کسی نے واقع میں شراب نہ پی ہو اور وہ دعویٰ کرے کہ میں نے بڑی قیمتی شراب پی ہے تو اس کی حالت خود اس کی تکذیب کر دیگی (۱)۔ بلکہ اگر وہ جھوٹ موٹ جھومنے بھی لگے جب بھی جاننے والے سمجھ جائیں گے کہ محض مکر ہے

(۱) اس کا حال اس کو جھٹلا دے گا۔

گو ناواقف دھوکا میں آجائے جیسے ایک مولوی صاحب دھوکا میں آگئے تھے۔

رڑکی میں ایک مولوی صاحب واعظ آئے ہوئے تھے ایک سوداگر ان کو اپنی دکان پر لے گیا۔ اس زمانہ میں سوڈا واٹر کی بوتلیں نئی نئی چلی تھیں اور پہلے پہلے اس کی ڈاٹ اندر نہ ہوتی تھی۔ بلکہ بڑے زور سے باہر نکلا کرتی تھی۔ اس سوداگر نے مولوی صاحب کے سامنے ایک بوتل کھول کر پی۔ بوتل کھلتے ہی اس میں جوش ہوا اور ڈاٹ نکل کر دور جا پڑی۔ مولوی صاحب شراب سمجھے اور اس کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ تم شراب پیتے ہو۔ سوداگر نے کہا یہ شراب نہیں ہے بلکہ سوڈا واٹر ہے جو کہ لیمون وغیرہ سے بنتا ہے بہت عمدہ چیز ہے اس سے کھانا خوب ہضم ہوتا ہے۔ غرض بہت سی تعریفیں کر کے مولوی صاحب سے کہا کہ ایک بوتل آپ بھی پئیں۔ اول تو ان کو یقین نہیں آیا اور انکار کرتے رہے مگر اس کے قسم کھا کر اطمینان دلانے سے ایک بوتل پی لی۔

اب سوداگر نے یہ حرکت کی کہ جب مولوی صاحب بوتل پی چکے تو اس نے جھومنا شروع کیا۔ مولوی صاحب بڑے گھبرائے کہ یہ ضرور شراب ہے اس کو نشہ ہونے لگا ہے تھوڑی دیر بعد میں میرا بھی یہی حال ہوگا۔ اس کم بخت نے مجھے بھی فضیحت کیا(۱)۔ لوگ کیا کہیں گے کہ رات کو مولوی صاحب وعظ کر رہے تھے اور آج شراب پی رہے ہیں۔ اس سوداگر سے کہا کہ للہ مجھے کوٹھڑی میں بند کر دے تاکہ میرے نشہ کو کوئی دیکھ نہ سکے اور خدا کے لئے مجھے رسوا نہ کرنا میں تو پہلے ہی انکار کرتا تھا مگر تم نے دھوکا دیکر مجھے شراب پلا دی۔ جب بہت پریشان ہوئے۔ تب اس نے تسلی کی اور کہا کہ یہ تو مذاق تھا۔

سو اس قصہ میں جو مولوی صاحب کو دھوکا ہوا تو وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب

(۱) مجھے رسوا کیا ہے۔

نے کسی شرابی کو کبھی دیکھا نہ تھا ورنہ سوداگر کے جھومنے سے ان کو ہرگز دھوکا نہ ہوتا کیونکہ اس کا نشہ آورد سے تھا اور شراب کا نشہ آمد سے ہوتا ہے (۲) اور آورد و آمد میں (۲) زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں کی صورت ہی بتلا دیتی ہے کہ اس نے شراب پی ہے اور یہ مکرر کر رہا ہے۔

کلام کا اثر

دیکھئے اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ میں روز گھی دودھ اور مرغن کھانے اور مقویات کھایا کرتا ہوں مگر صورت پر مردنی چھائی (۳) رہی ہو تو کیا اس کے دعویٰ کو کوئی تسلیم کرسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر شخص کہے گا کہ صورت یہ بتلا رہی ہے کہ شاید میاں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر روکھی روٹی بھی نہیں ملتی۔

اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس اطلاع آئی ہو کہ تم پر فوجداری کا مقدمہ قائم ہوگیا ہے جس میں چار سال کی قید بامشقت ہوگی اور وہ دوستوں میں بیٹھ کر سنے اور اس خبر کو ان سے مخفی رکھ کر دعویٰ کرے کہ میرے پاس بڑی مسرت انگیز خبر آئی ہے مگر حالت یہ ہے کہ زبان خشک ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی جم رہی ہے صورت پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں تو کون مان لے گا کہ اس کے پاس خوشی کی خبر آئی ہے۔

نرا دعویٰ کافی نہیں

یوں ہی سمجھ لو کہ محض دعوائے خشیت سے خشیت کا ثبوت نہیں ہوسکتا بلکہ مدعی کی قلعی اس کی حالت سے خود ہی کھل جاتی ہے۔ صاحب خشیت کی حالت ہی اور ہوتی ہے اس کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے دل میں خشیت

(۱) اس کا نشہ خود ساختہ تھا اور شراب کا نشہ خود بخود ہوتا ہے (۲) آنے اور لانے میں زمین آسمان کا فرق ہے (۳) صورت سے کمزوری عیاں ہو۔

ہے۔ گو وہ ظاہر میں کیسا ہی ہنس رہا ہو جیسا کہ مقدمہ فوجداری والا۔ گو کتنا ہی تکلف کر کے دل کی حالت کو چھپانا چاہے مگر چھپ نہیں سکتی ۔

کہ عشق و مشک را نتواں نہفتن

''کہ عشق اور مشک کو نہیں چھپا سکتے''

می تواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن زردی رنگ رخ و خشکی لب را چہ علاج

''عشق تو لوگوں سے چھپا سکتے ہیں چہرہ کے رنگ زرد ہونے اور ہونٹ کی خشکی کا کیا علاج ہو سکتا ہے''

حقیقی خشیت کا اثر

حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے جب علوم ظاہرہ کی تکمیل کر کے وطن واپس آئے تو حضرت نے ان کا وعظ کہلوایا انہوں نے بڑے بڑے مضامین ترہیب و ترغیب کے بیان کئے۔ مگر مجمع پر خاک اثر نہ ہوا۔ جب وہ بیان ختم کر چکے تو حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ ممبر پر تشریف لے گئے اور اپنا ایک معمولی قصہ اسی رات کا بیان فرمایا کہ رات ہم نے روزہ کی نیت کی تھی اور سحری کے لئے کچھ دودھ رکھا تھا ایک بلی آئی اور دودھ پی گئی۔ بس! اتنا کہنے پائے تھے کہ مجمع کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ کوئی روتا تھا کوئی چیختا تھا۔ کسی نے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ صاحب زادے کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بھی کوئی مضمون تھا جس پر لوگ اتنے متاثر ہوئے۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صاحب زادے ابھی تمہارا علم زبان ہی تک ہے اس کو دل میں پہنچاؤ۔ تو پھر تمہاری ادنیٰ بات بھی دلوں میں گھر کر جائے گی۔

قلب کا اثر

صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ بددین آدمی اگر دین کی باتیں بھی کرتا ہے تو ان میں ظلمت ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی تحریر کے نقوش میں ایک گونہ ظلمت لپٹی ہوئی ہوتی ہے اور دین دار دنیا کی باتیں کرے تو ان میں نور ہوتا ہے کیونکہ کلام دراصل قلب سے ناشی ہوتا ہے(۱) تو قلب کی حالت کا اثر اس میں ضرور ہوتا ہوگا۔

ان الکلام لفی الفؤاد وانما　　جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

''یعنی بلاشک کلام دل میں ہوتا ہے زبان کو دل پر دلیل ٹھہرایا گیا''

اور کلام تو کلام لباس تک میں قلب کا اثر سرایت کرتا ہے چنانچہ بزرگوں کے لباس میں بھی نور ہوتا ہے جس کو مشاہدہ کرنے والے مشاہدہ کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی بیٹھنے کی جگہ میں بھی نور ہوتا ہے۔

میرے استاد رحمۃ اللہ علیہ ایک بار کسی اسٹیشن پر پہنچ کر ایک جگہ بیٹھ گئے پھر معاً فرمایا کہ یہاں بیٹھتے ہی قلب انوار سے معمور ہوگیا۔ کیا بات ہے یہاں یہ انوار کیسے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک بزرگ وہاں آکر تھوڑی دیر بیٹھے تھے وہ چلے بھی گئے مگر پتھر ان کی صحبت سے الماس ہوگیا یہی تو اصل ہے تبرکات کی۔

بے دینوں کی کتب کے مطالعہ سے احتراز

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ بے دینوں کی کتابوں میں ظلمت کی آمیزش ہوتی ہے گو اس میں مضامین اچھے ہی لکھے ہوں اور اس کا مشاہدہ بھی اہل قلب کو ہوتا ہے چنانچہ ایک شخص مولانا غلام علی صاحب کی مجلس میں آیا تو فرمایا کہ اس کے

(۱) کلام اصل میں دل سے تعلق رکھتا ہے۔

آتے ہی مجلس میں ظلمت چھا گئی ہے۔ تلاش کرو اس کے پاس کیا ہے۔ دیکھا تو شیخ بوعلی سینا کی کوئی کتاب اس کی بغل میں تھی۔

صاحبو! متکلم کا اثر اس کے کلام میں اور مصنف کے قلب کا اثر تصنیف میں ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے بے دینوں کی کتابوں کا مطالعہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے کیونکہ مطالعہ کتب مثل صحبت مصنف کے ہے جو اثر بے دین کی صحبت کا ہوتا ہے وہی اس کی کتاب کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مگر آج کل مسلمانوں کو اس کی ذرا پروانہیں ہر شخص جو کتاب چاہتا ہے دیکھنے لگتا ہے۔

مطالعہ میں احتیاط

صاحبو! اللہ کے واسطے، رسول کے واسطے بے دینوں کی خصوصاً مخالفین اسلام کی کتابیں ہرگز مت دیکھو۔ طلباء بھی ایسی کتابیں نہ دیکھا کریں جواب دینے اور رد کرنے کے لئے بھی نہ دیکھیں۔

الا ان یامرہ واحد من الکاملین بضرورۃ

''مگر یہ کوئی کاملین میں سے ضرورت کی وجہ سے اس کا حکم دے دے''

حدیث میں آیا ہے کہ دجال کی خبر سن کر اس سے دور بھاگو پاس نہ جاؤ۔ مناظرہ اور رد کے واسطے بھی نہ جاؤ کیونکہ بعض لوگ مناظرہ کے واسطے جائیں گے تو طلباء کو چونکہ ان کا علم بھی ناقص ہے مناظرہ کے قصد سے بھی مخالفین کی کتابیں نہ دیکھنا چاہئیں کیونکہ پہلوان اگر کسی سے کشتی کرنا چاہے تو اس کو پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ مقابل اپنے سے کمزور ہے یا زبردست اگر کمزور ہے تو مقابلہ کرے ورنہ اس سے دور ہی رہے۔ ایسے شخص کا مقابلہ وہ کرے جو اس سے بھی زیادہ زبردست ہو۔ پس محقق کے سوا کسی کو اجازت نہیں کہ مخالفین کے رد کے درپے ہو کیونکہ غیر محقق

پر اندیشہ ہے۔ کبھی خود ہی کسی شک میں نہ پڑ جائے آج کل مخالفین کی کتابوں میں بہت گندے مضامین ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر اول وہلہ میں (۱) ناقص کو پریشانی ہوتی ہے تو ایسی کتابیں ہرگز نہ دیکھنی چاہئیں۔

تقسیم موئے (۲) مبارک

میں نے اسی سفر میں ریل کے اندر ایک آریہ کی کتاب دیکھی جو ایک مسافر نے مجھے دکھلائی۔ اس میں کم بخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ تقسیم موئے مبارک پر اعتراض کیا ہے کہ نعوذ باللہ آپ نے انسان پرستی کی تعلیم فرمائی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال حج وداع میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو تقسیم فرمائے تھے۔ اس پر یہ شخص انسان پرستی کی تعلیم کا اعتراض کرتا ہے۔ ارے تو عشق کے آثار کو کیا سمجھے۔ کافر کو عشق سے کیا تعلق؟ بات یہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ میرے بعد یہ میری صورت کو ترس جائیں گے جس سے ان کو بہت بے چینی ہوگی۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال تقسیم فرمادیئے تا کہ ان کو دیکھ کر کسی قدر تسلی ہوجایا کرے۔ جس نے عشق کا چرکہ کھایا ہے (۳) وہ سمجھ سکتا ہے کہ محبوب کے بعد اس کی نشانیوں کو دیکھ کر کس قدر تسلی ہوتی ہے عشاق کی تو یہ حالت ہے کہ وہ اس خبر ہی سے مسرور ہیں کہ دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زلف کا موئے مبارک موجود ہے گو ہم نے دیکھا بھی نہیں ؂

مرا زلف تو موئے بسند ست ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

''یعنی تیری زلف کا ایک بال بھی مجھے بہت ہے نہیں بلکہ اس کی خوشبو ہی کافی ہے''

یہ شعر اسی موقع پر شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہم نے

---

(۱) ابتداءً (۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ کو اپنے بال تقسیم فرمانا (۳) جس کو عشق کا زخم لگا ہے۔

گوموئے مبارک کی زیارت نہیں کی مگر خبر تو ملی ہے کہ ہاں دنیا میں موجود ہے بس ہم کو تسلی کے لئے کافی ہے۔

تو بتلائیے عشاق کی تسلی کرنا یہ کون سی انسان پرستی ہے اس کو پرستش سے کیا تعلق۔ آخر ایک دوست سفر میں جاتے ہوئے جو اپنے دوست سے انگوٹھی یا اور کوئی نشانی مانگتا ہے اور وہ نشانی دے دیتا ہے تو کیا وہ اس کی پرستش کرتا ہے ہرگز نہیں۔ پس اسی قبیل سے حضور ﷺ کا یہ فعل تھا۔ اس پر اعتراض کیوں ہے۔

یہ تو جواب عاشقانہ مذاق پر ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس واقعہ میں اتفاق کو سنبھالا تھا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ایسے عاشق تھے کہ وضو کے پانی پر بھی گرتے تھے اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ آپ ﷺ کا چھینٹا میرے اوپر گرے۔ تو وہ حضور ﷺ کے بالوں کو کب چھوڑتے جو کہ اجزاء جسم تھے۔ اگر آپ ﷺ تقسیم نہ فرماتے تو عجب نہ تھا کہ تقابل کی (۱) نوبت آجاتی اس لئے حضور ﷺ نے خود ہی تقسیم فرمادیئے یہ جواب اس معترض کے مذاق پر ہے کیونکہ یہ لوگ اتحاد و اتفاق کو دین و ایمان سمجھتے تھے (گو اس کی توفیق کبھی نہ ہو ۱۲)

بھلا حضور ﷺ نعوذ باللہ انسان پرستی کی تعلیم دیتے۔ حالانکہ دنیا کو توحید کا علم ہی آپ ﷺ کے ذریعے سے ہوا۔ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے تمام اہل ادیان شرک میں مبتلا تھے کوئی توحید کو جانتا بھی نہ تھا۔

پھر اس معترض نے ایک واقعہ کو تو دیکھ لیا اور دوسرے واقعات نہ دیکھے جن سے اس واقعہ کی حقیقت واضح ہوجاتی۔

(۱) اس کے حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی نوبت آجاتی۔

قبر پرستی

ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اہل فارس اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہیں تو کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا توبہ کرو توبہ۔ سجدہ خدا کے سوا کسی کو نہ کرنا چاہیئے۔ پھر فرمایا۔

((ارء یت لومررت علی قبری اکنت تسجد لہ))

بتلاؤ تو اگر تم میری قبر پر کبھی گزرو تو کیا قبر کو بھی سجدہ کرو گے۔ صحابی نے کہا نہیں۔ سبحان اللہ! صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طبائع کیسی سلیم تھیں اور جبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ سوال فرمایا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین تھا کہ صحابہ کی طباع میں یہ بات جمی ہے کہ قبر سجدہ کے قابل نہیں۔

مگر اب تو یہ مذاق ہے کہ اگر آج کل کے مسلمانوں سے یہ سوال ہوتا تو بہت سے یوں کہتے کہ جی ہاں۔ ہم تو آپ کی قبر کو بھی سجدہ کریں گے۔ کیونکہ آجکل قبر پرستی بہت ہو رہی ہے بزرگوں کے مزارات پر سجدے ہوتے ہیں بلکہ بعض جگہ اولیاء بھی مدفون نہیں ہوتے کہیں ان کا تولیہ دفن ہوتا ہے کہیں کتا دفن ہے۔ کہیں چارپائی دفن ہے اور ان پر نذریں چڑھتی ہیں۔

ایک صاحب کہتے تھے کہ آج کل کسی کو ولی بنا دینا طوائف کے قبضہ میں ہے بس جہاں کسی کی قبر پر ایک بار مجرا ہو گیا۔ وہ ولی مشہور ہو گئے مگر صحابہ کا مذاق نہایت صحیح تھا۔

حیات انبیاء

انہوں نے جواب دیا کہ خاص حیات بعد وفات کے بھی مسلم ہے(۱)۔

صحابہ بھی اس سے واقف تھے گو وہ حیات اس حیات کے مثل نہیں بلکہ حیات برزخیہ ہے لیکن انبیاء کی حیات برزخیہ ایسی قوی ہوتی ہے جس کے بعض آثار احکام دنیا میں بھی ظاہر ہوتے ہیں مثلاً ان کی بیبیوں سے کسی کو نکاح جائز نہیں ہوتا گو یہ امر منصوص تو آپ ہی کے لئے ہے مگر ظاہراً عام معلوم ہوتا ہے اور ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔ یہ حکم نص میں عام ہی وارد ہوا ہے۔

نحن معاشر الانبیاء لا نورث ماترکناہ صدقة (فتح الباری لابن حجر ۱۲:۸)

''ہم انبیاء کے گروہ کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم ترکہ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے''

اوران کے اجساد کو زمین نہیں کھاسکتی۔ یہ اثر شہداء کے لئے بھی منصوص ہے بہرحال انبیاء قبر میں زندہ ہوتے ہیں۔

قبر کو سجدہ کی ممانعت

مگر بایں ہمہ صحابہ کا مذاق سلیم دیکھئے کہ اس پر بھی یہی جواب دیا کہ قبر کو تو سجدہ نہ کریں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر ابھی کیوں کرتے ہو (اس میں یہ بتلادیا کہ جو چیز ایک وقت میں موت کی وجہ سے قابل سجدہ نہیں رہتی وہ کسی وقت بھی سجدہ کے قابل نہیں ۱۲) بس سجدہ خدا کے سوا کسی کو جائز نہیں۔ حالانکہ سجدہ مطلقاً عبادت بھی نہیں ہے بلکہ بہ نیت عبادت ہو تو عبادت ہے ورنہ سجدہ تحیت شرائع (۲) سابقہ میں جائز تھا۔ لیکن حضور ﷺ نے اپنے واسطے اس کو بھی گوارا نہ فرمایا اور

(۱) تسلیم شدہ ہے (۲) بطور سلام کے سجدہ کی ہیئت بنانا گزشتہ شریعتوں میں جائز تھا۔

غیر اللہ کے لئے سجدہ کو مطلقاً حرام کردیا۔ تو جس ذات نے اپنے لئے ایک خاص طرز کی تحیت کو بھی پسند نہ کیا ہو کیا نعوذ باللہ آپ ﷺ ایسے ہوتے تو پھر صحابہ کو جب کہ وہ خود سجدہ کرنا چاہ رہے تھے کیوں کر منع کردیتے۔ جو شخص اپنی پرستش کرانا چاہتا ہے وہ تو ایسے موقع کو غنیمت سمجھتا ہے کہ مجھے کہنے ضرورت نہ پڑی معتقدین خود ہی درخواست کررہے ہیں مگر حضور ﷺ نے نہ زندگی میں اس کی اجازت دی نہ بعد وفات کے اجازت دی۔ چنانچہ عین وصال کے قریب ارشاد فرمایا۔

لعن اللہ الیھود والنصاری اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد (الصحیح للبخاری:۱۔۱۱۶،۲)

خدا تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت کریں جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ اس میں صحابہ کو تنبیہ تھی کہ تم اپنے نبی ﷺ کی قبر سے ایسا معاملہ نہ کرنا۔

اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد (مسند الامام أحمد:۲۔۲۴۶)

''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنایا جائے جس کی پرستش ہو ف۱۲''

تو اس معترض کم بخت نے حضور ﷺ کی یہ تعلیم نہ دیکھی جس سے حضور ﷺ کے مذاق عبدیت کا پتہ چلتا ہے۔ بس ایک تقسیم شعر کا (۱) واقعہ دیکھ لیا۔ اور اپنی طرف سے اس کی وجہ تراش لی کہ اس سے انسان پرستی کی تعلیم مقصود تھی۔

ارے ظالم! جس شخص کا یہ مذاق ہوتا ہے اس کے دوسرے احوال واقوال اس کے معارض نہیں ہوا کرتے۔ مگر حضور ﷺ کے تمام احوال واقوال اس قصد کے صریح معارض ہیں۔ پھر یہ کہنا کیوں کر صحیح ہے کہ آپ ﷺ کا یہ قصد تھا کہ کیا اس فعل کی وجہ کچھ اور نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ میں نے بتلا دیا کہ حضور ﷺ کے اس فعل میں سیاسی مصلحت بھی تھی۔ اور عاشقانہ مصلحت بھی تھی۔ انسان پرستی سے اس کو کچھ بھی تعلق نہیں یہ گفتگو درمیان میں آگئی تھی۔

(۱) بال تقسیم کرنے کا واقعہ دیکھ لیا۔

صحبت کا فائدہ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ قلب کا اثر انسان کے کلام اور لباس تک میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ کے تبرکات میں اثر ہوتا ہے اور صحبت میں اس سے زیادہ اثر ہوتا ہے ؎

یک زمانہ صحبت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

"یعنی اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی سو سال کی بے ریا عبادت و طاعت سے بہتر ہے"

یہ تو صحبت کا ذکر تھا اور دیدار کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اے لقائے تو جواب ہر سال مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

" آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے بلاشبہ آپ سے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے"

ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ بزرگوں کی صورت دیکھتے ہی اشکالات رفع ہوگئے بعض دفعہ بزرگوں کے پاس اس قصد سے گئے کہ ان سے اس اشکال کا جواب پوچھیں گے مگر چہرے پر نظر پڑتے ہی اشکال خود بخود حل ہوگیا۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بزرگوں کے تصور سے بھی نفع ہوتا ہے چنانچہ یہی اصل ہے مسئلہ تصور شیخ کی جو صوفیاء کرام بتلایا کرتے تھے مگر لوگوں نے بعد میں اس کے اندر غلو کرلیا۔ اسی لئے مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے منع فرمایا۔ مگر وہ مطلق تصور کو منع نہیں کرتے بلکہ اس خاص تصور کو منع کرتے ہیں جو عوام میں اس وقت رائج تھا۔ اور اگر کہیں ان کے کلام میں اطلاق ہوتو وہ اطلاق ایسا ہوگا جیسے آج کل ہم کہہ دیتے

ہیں کہ رہن رکھنا حرام ہے حالانکہ اس کا جواز فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ "سو اطمینان کا ذریعہ رہن رکھنے کی چیزیں ہیں جو صاحب حق کے قبضہ میں دے دی جائیں گی" میں منصوص ہے مگر مراد یہ ہے کہ رہن متعارف حرام ہے جس میں انتفاع بالمرہون کی شرط ہوتی ہے۔(۱) ایسے ہی مولانا شہید کے کلام میں مطلق تصور سے وہ خاص تصور مراد ہے جو اہل غلو میں اس وقت رائج تھا۔ بعض لوگ واقعی اس میں حد سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

تصور شیخ

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ تصور شیخ کیسا ہے؟ میں نے جواب دینے سے پہلے پوچھا کہ تم تصور شیخ کا مطلب کیا سمجھے ہو کہا خدا تعالیٰ کو پیر کی صورت میں سمجھنا۔ میں نے کہا یہ تو صریح شرک ہے۔ اسی تصور کو مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے منع فرمایا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس کے ابطال میں اس آیت سے تمسک کیا ہے۔

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ

"یہ کیا واہیات مورتیں ہیں جن کی عبادت پر تم جمے بیٹھے ہو"

اور یہ آیت مشرکین ہی کے متعلق ہے باقی مطلق تصور کو وہ حرام نہیں کہتے ورنہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی صراحۃً رد کرتے۔ کیونکہ شاہ صاحب نے "القول الجمیل" میں تصور شیخ کا مسئلہ لکھا ہے اور جن کا نام مولوی اسمٰعیل شہید ہے وہ کسی کی للو پتو(۲) کرنے والے نہ تھے بڑے صاف تھے۔ اگر وہ مطلق تصور کو سمجھتے تو اس کی

(۱) عام طور پر جس طرح آج کل رہن رکھتے ہیں کہ رہن رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھاتے ہیں رہن رکھنے کی یہ صورت حرام ہے (۲) کسی کی چاپلوسی کرنے والے۔

پرواہ نہ کرتے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو جائز لکھا ہے۔ بلکہ بے دھڑک ان کا بھی رد کر دیتے کہ اس مسئلہ میں ان سے تسامح یا غلطی ہوئی ہے مگر ان حضرات کا انہوں نے بالکل رد نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ نفس تصور کو وہ بھی جائز سمجھتے تھے ہاں غلو کو حرام کہتے تھے۔

تصورِ شیخ میں کی جانے والی کوتاہیاں

پس اس مسئلہ میں آج کل دو قسم کی کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض نے ابوجہل ہونے کی وجہ سے اس میں غلو کر لیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ایک شخص کا قصہ بیان کیا ہے کہ وہ خدا کو پیر کی صورت میں سمجھنے کو تصور شیخ جانتا تھا۔ اور اگر محض تصور کا مرتبہ ہو تو اس میں دوسرے لوگوں نے غلو کیا ہے جو علماء ظاہر کہلاتے ہیں۔ انہوں نے اس کو بھی حرام کہہ دیا۔ حالانکہ اس میں خرابی ہی کیا ہے۔ بلکہ یہ تو ازالۂ خطرات بمعنی اضمحلال (۱) میں مفید ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ عقلی مسئلہ ہے۔ النفس لا تتوجه الى شيئين فى اٰن واحد۔ نفس کو ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف توجہ نہیں ہوسکتی۔ پس خطرات اسی وقت تک آئیں گے جب تک قلب کو کسی خاص چیز سے تعلق نہیں اور اگر کسی شے سے قلب کو تعلق ہو (۲) جائے تو پھر خطرات نہ آئیں گے۔ اسی لئے ازالۂ خطرات کے واسطے قلب کو کسی دوسری طرف متوجہ کر دینا مفید ہے اگر حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو جائے تو اس سے بہتر کیا ہے۔ یہ تو اصل مقصود ہے۔ لیکن مبتدی کے قلب کو ابتداء میں حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق قوی دشوار ہے (۳) کہ اس کے ساتھ اور کسی شے کا تصور نہ آوے کیونکہ

---

(۱) دل میں آنے والے خطرات کو زائل کرنے اور اس کو کمزور کرنے میں مفید ہے (۲) اگر کسی کے ساتھ دل جڑ جائے اور اس کا خیال دل میں بس جائے پھر وساوس نہیں آئینگے (۳) ایسا مضبوط تعلق مشکل ہے۔

حق تعالیٰ محسوس و مشاہد نہیں غائب از نظر ہے اور مبتدی کا تصور غائب کے ساتھ نہیں جمتا (۱)۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ کسی محسوس چیز کا تصور کیا جائے جو آسانی کے ساتھ دل میں قائم ہو جائے۔ گو اس کے لئے بیوی کا تصور بھی کافی ہے۔ مگر صوفیہ نے شیخ کو اس لئے تجویز کرلیا کہ وہ محسوس ہونے کے ساتھ معین فی الدین (دین کا مددگار) بھی ہے۔ اس کی محبت تعلق سے مانع نہیں بلکہ اس کو بڑھانے والی ہے اور بیوی کا یا اور کسی چیز کا تصور کیا گیا اور ان کی محبت دل میں جم گئی تو بعد ازالۂ خطرات کے پھر اس محبت کو بھی نکالنا پڑے گا۔ مشقت دوہری ہو جائے گی۔ اور تصور شیخ سے اگر اس کی محبت دل میں جم گئی تو اس کے نکالنے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ وہ تو جتنی بھی زیادہ ہو تعلق مع اللہ میں اسی قدر نافع ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اور چیزوں کی محبت تو کسی نفسانی غرض سے ہوتی ہے اور شیخ کے ساتھ محبت کسی نفسانی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ محض خدا تعالیٰ کے علاقہ سے ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کے علاقہ سے کسی کے ساتھ محبت کرنا یہ درحقیقت خدا ہی کے ساتھ محبت ہے (۲)۔ دیکھو اگر ہماری وجہ سے کوئی ہماری اولاد یا متعلقین کے ساتھ محبت کرے تو اس کو ہم اپنی ہی محبت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح شیخ سے چونکہ خدا تعالیٰ کے علاقہ سے محبت ہوتی ہے تو وہ حضرت حق ہی کی محبت ہے جو تعلق مع اللہ میں حاجب (۳) نہ ہوگی بلکہ معین ہوگی (۴)۔

اسی لئے صوفیاء نے ازالۂ خطرات کے واسطے تصور شیخ کو تجویز کیا ہے اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ لا الٰہ الا اللّٰہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" میں جو غیر اللہ کی نفی کی جاتی ہے تو یہاں نفی غیر سے منطق مراد نہیں تاکہ نفی محبت رسول اللہ ﷺ کا

(۱) وہ نظروں سے پوشیدہ ہے ابتداء میں اس کا تصور قائم کرنا مشکل ہے (۲) اس لئے کہ شیخ سے تعلق بھی اسی لئے قائم کیا ہے کہ اللہ سے تعلق ہو جائے (۳) رکاوٹ (۴) مددگار۔

شبہ ہو[۱]۔ بلکہ عرفی غیر مراد ہے اور عرف میں غیر کہتے ہیں اجنبی کو۔ چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ بھائی تم غیر نہیں ہو۔ تو کیا وہ منطقی عین ہے اور کیا اس پر احکام بھی عین کے جاری ہوں گے کہ دونوں کی بیویاں ایک دوسرے کے لئے حلال ہوجائیں۔ ہرگز نہیں۔

اسی طرح یہاں پر غیر سے مراد اجنبی ہے۔ جس کا تعلق حق تعالیٰ سے مانع ہو[۲] اس معنی کو رسول اللہ ﷺ کی محبت اور شیخ کی محبت غیر محبت حق نہیں تو ان کی نفی بھی مقصود نہیں مگر صوفیا نے نااہلوں سے اخفاء کرنے کے لئے منطقی و عرفی اصطلاحات میں خلط کر رکھا ہے تا کہ ان کو راز کا پتہ نہ چلے چنانچہ کہتے ہیں ؎

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تابمیرد در رنج خود پرستی

''مدعی سے عشق و مستی کے راز بیان مت کرو ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو''

اور فرماتے ہیں ؎ اصطلاحے ہست مرابدال را ''ابدال کی ایک اصطلاح ہے''

ان کی اصطلاحیں سب سے الگ ہیں۔ اس لئے پہلے ان کی اصطلاحیں معلوم کرنا چاہئیں۔ پھر اعتراض کرنا چاہیئے۔

صفات الٰہی کا مظہر

جب غیر کے متعلق ان کی اصطلاح معلوم ہوگئی تو اب اس شعر پر کیا اعتراض ہے ؎

ہرچہ بینم درجہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(۱) کیونکہ منطقی طور پر تو حضور بھی اللہ کا غیر ہیں ان کی نفی بھی لازم آتی ہے اس لئے یہاں عرفی غیر مراد ہے

(۲) رکاوٹ۔

''یعنی چیزیں جہاں میں آپ کی مامور ہیں۔ ہر ایک سے آپ ہی کا جلوہ نظر آرہا ہے''

مطلب یہ ہے کہ تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے۔ ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے اس لئے غیر کا وجود ہی نہیں۔ پس اس معنی کو محبت شیخ بھی غیر محبت حق نہیں کیونکہ وہ وصول الی اللہ میں معین ہے۔ یہ اصل ہے تصور شیخ کی۔

مگر اس کی یہ صورت اس شرط سے جائز ہے کہ اسی کو لے کر نہ بیٹھے کہ اس کا وظیفہ خاص مقرر کرے کہ اس وقت اگر خدا تعالیٰ کا تصور آجائے تو قصداً اس کو بھی دفع کردے۔ اسی سے منع کیا ہے مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے۔ تو بزرگوں کی صحبت وزیارت تو بڑی چیز ہے۔ ان کا کلام بھی نافع ہے۔

تبرکات کی حقیقت

یہی اصل ہے تبرکات کی کیونکہ ان کی چیزوں کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کی یاد سے دل میں نور آتا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہوتا ہے مگر اس سے بزرگوں کی تصویر رکھنے کی اجازت نہ سمجھ لی جائے۔ کہ اس سے بھی یاد تازہ ہوتی ہے کیونکہ لباس اور تصویر میں فرق ہے۔ لباس کی مذکریت [1] اور قسم کی ہے اس میں عبادت کا اندیشہ نہیں اور تصویر رکھنے میں عبادت کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ دنیا میں بت پرستی اسی تصویر کے رکھنے سے پھیلی ہے۔

غرض جب یہ بات محقق ہوگئی کہ قلبی کیفیات کا اثر کلام اور لباس تک میں ظاہر ہوتا ہے تو اب بے دینوں کی کتابوں اور ان کے لباسوں سے احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے قلب میں ظلمت ہی پیدا ہوتی ہے گو وہ کیسا ہی تقدس کا دعویٰ کریں اور

(۱) لباس سے یاد اور طرح کی آتی ہے۔

عمدہ عمدہ مضامین بیان کریں۔مگران کے دعووں کی یہ حالت ہوگی ؎

وقـــوم یـــد عـــون وصـــال لیـلـی ولیـلـــی لا تـقـــر لهـــم بـذاك

''لوگ (لیلیٰ) محبوب حقیقی کے وصال کا دعویٰ کرتے ہیں اور محبوب ان کے لئے اس کا اقرار نہیں کرتا''۔

اور دینداروں کی باتیں دنیوی معاملات کے متعلق بھی نور سے خالی نہ ہوں گی۔ تجربہ کر کے دیکھ لو۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ امتحان کرنے والا سلیم الطبع ہو۔

صاحبو! اگر دو بھائی ایک شب میں اپنی بیویوں کے پاس جائیں جن میں ایک مرد ہے اور ایک نامرد ہے۔تو صبح کو دونوں کی صورت اور بات چیت سے تاڑنے والے تاڑ جائیں گے کہ کس کوتو وصال نصیب ہوا ہے اور کون محروم رہا۔

خشیت کا اثر

خدا کے بندو! اتنی اتنی باتیں تو چھپتی نہیں ہیں اور خدا کی خشیت جس سے پہاڑ ہل جاتے ہیں چھپی رہ جائے گی۔ کہ آپ کے دل میں خشیت ہو اور اعمال میں اس کا ظہور نہ ہو۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔مگر بعض لوگ دھوکا میں ہیں۔اپنے آپ کو صاحب نسبت اور صاحب خشیت سمجھتے ہیں حالانکہ وہاں پتہ بھی نہیں۔شاید انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ تصور میں حصول اشیاء بانفسہا فی الذہن ہوتا ہے (۱)۔اور نسبت وخشیت کا تصور ہمیں حاصل ہے تو ہم واقعی صاحب خشیت وصاحب نسبت ہو گئے اگر یہی حصول اشیاء بانفسہا ہے۔تو جو شخص پہاڑ کا تصور کرتا ہے چاہیئے کہ اس کے

(۱) جب کسی چیز کا تصور کریں گے تو اس کی ذات ہمارے ذہن میں موجود ہوتی ہے۔

ذہن میں پہاڑ بعینہ موجود ہو[1]۔ پھر اس تصور سے اس کا ذہن منشق کیوں نہیں ہوا[2] اتنی بڑی چیز ذرا سے ذہن میں کیوں کر سما گئی۔ یہ تو اہل ظاہر کی کوتاہی تھی کہ وہ محض تصور خشیت کو حصول خشیت سمجھے ہوئے ہیں۔

اب میں مشائخ کے اترے پترے کھولتا ہوں [3]۔ ان میں بھی بہت لوگ دھوکا میں ہیں۔ کہ ایک شخص کو مقامات کا ذوق حاصل تھا اس نے حالات و کیفیات بھی دیکھے تھے مگر ابھی رسوخ نہ ہوا تھا کہ شیخ بن کر بیٹھ گئے۔ تربیت کا طریق بھی جانتے ہیں اور لوگ ان کے ہاتھ سے کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔ مگر اب کچھ دنوں کے بعد وہ مقامات واحوال سے خالی ہیں۔ آخر وہ اثر کہاں گیا۔ اگر ان کے اندر خشیت موجود ہے تو معاصی سے اجتناب کیوں نہیں ہوتا۔ اگر تواضع موجود ہے تو دوسروں کے کہنے سننے سے مرچیں کیوں لگتی ہیں۔

صرف چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا عمل ضروری ہے

تو بات یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کا مزا چکھا تھا اس سے پیٹ نہیں بھرا تھا مزا چکھ کر بے فکر ہوگیا کہ جب چاہوں گا خشیت وتواضع کا حال غالب کرلوں گا مگر محض چاہنے سے کیا ہوتا ہے جب تک اسکا تحقق نہ ہو۔ چاہنے کو تو کفار نے بھی کہا تھا۔

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا کہ اگر ہم چاہیں گے تو قرآن جیسا کلام بنادیں گے۔ مگر کبھی کر کے تو نہ دکھایا۔ بس ایسا ہی اس شخص کا چاہنا ہے کہ جب چاہوں گا خشیت وتواضع حاصل کرلوں گا مگر حاصل ایک دن بھی نہ کی۔ پھر اس حالت میں اس کا شیخ بن جانا ایسا ہے جیسے ایک شخص میں قوت نکاح موجود ہو اور وہ کہے کہ میں جب

(۱) پہاڑ اس کے ذہن میں سما جائے (۲) جب پہاڑ اس کے دماغ میں آ گیا تو اس سے اس کا ذہن و دماغ پھٹ کیوں نہیں گیا (۳) مشائخ کا حال بیان کرتا ہوں۔

چاہوں گا نکاح کر کے بچہ جنوا لوں گا۔ اس لئے تم مجھے اب ہی باپ کہو۔ تو بھلا اس کو ابھی سے باپ کیوں کر کہا جائے اس کو چاہیئے اول نکاح کرے پھر بیوی کے پاس جائے جب حمل قرار پاکر بچہ پیدا ہو جائے گا اس دن خود ہی باپ ہو جائے گا کسی کے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

مقامات میں رسوخ کی ضرورت

پس اے سالکین! محض مقامات کا مزا چکھ کر بے فکر نہ ہو جاؤ بلکہ ان میں رسوخ حاصل کرو۔ محض چاہنے کے اوپر نہ رہو کہ طریقہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے جب چاہیں گے تکمیل کر لیں گے۔ یاد رکھو اس طرح تکمیل نہ ہوگی اور تکمیل سے پہلے شیخ بن گئے تو پھر کبھی اس کی توفیق ہی نہ ہوگی۔ اور تکمیل کا صحیح طریقہ یہ ہے ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　　تا راہ بیں نہ باشی کے راہبر شوی

''اے بے خبر کوشش کر کہ تو خبردار ہو جائے جب تک تو راہ بیں (راستہ کا دیکھنے والا) نہ ہوگا رہبر نہیں بن سکتا''۔

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق　　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

''ادیب عشق کے سامنے حقائق کے مدرسہ میں ہاں اے لڑکے کوشش کر کسی دن باپ (شیخ) بھی بن جائے گا'' کہ شیخ بننے سے پہلے کسی کی جوتیاں سیدھی کرو اور باپ بننے سے پہلے بیٹا بننے کی کوشش کرو۔ ورنہ یاد رکھو چند روز میں اس شخصیت کی قلعی کھل جائے گی۔

کیونکہ آپ کی حالت یہ ہے کہ فرض کرو اگر کوئی ان کی تعریف کرنے لگے تو تواضع سے باتیں بناتے ہیں کہ میں تو کسی قابل نہیں۔ میں تو اپنے کو سب سے زیادہ

نالائق سمجھتا ہوں۔ پھر اگر کوئی یوں کہہ دے کہ ہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ واقعی آپ تو نالائق ہی ہیں تو پھر دیکھئے کیسے اچھلتے کودتے ہیں۔

اگر آپ یہ تاویل کریں کہ صاحب ہم اگر نالائق ہیں تو وہ نالائق کیوں کہے۔ اس سے تو انسان کو طبعًا ناگواری ہوتی ہے۔ دیکھو اندھا باوجود اپنے کو اندھا سمجھتا ہے مگر دوسرا کوئی اسے اندھا کہے تو برا لگتا ہی ہے کیونکہ اس نے طعن سے کہا ہے۔ اسی طرح ہمارا اچھلنا کودنا اس وجہ سے نہیں کہ ہم اپنے کو لائق سمجھتے ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے طعن کے ساتھ نالائق کہا۔

بہت اچھا ہم نہایت متانت وشفقت سے کہتے ہیں کہ افسوس تم کسی لائق نہیں۔ تم اب تک الو کے پٹھے ہی رہے (یہ جملہ نہایت متانت سے فرمایا تھا۔ اس لئے سارا مجمع لوٹ گیا ۱۲)

دیکھیں اس سے آپ کو ناگواری کس طرح نہیں ہوتی۔ حضرت جب تک حقیقی تواضع حاصل نہ ہوگی اس وقت تک چاہے کوئی طعن سے کہے یا شفقت سے ضرور ناگواری ہوگی۔ تو یہ بناوٹ چل نہیں سکتی ضرور ایک دن کھل کر رہے گی۔

اس لئے مقامات میں رسوخ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ محض مزا چکھنے پر قناعت نہ کرو ہانڈی کا مزہ چکھنے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ بھوک لگ جاتی ہے اور پیٹ خالی ہوجاتا ہے اس طریق میں اس قسم کے وسوسے اور دھوکے بہت ہیں کہ بعض دفعہ ذوق مقام سے حصول کا شبہ ہوجاتا ہے(۱) اسی لیے عارف فرماتے ہیں ؎

در راہ وسوسۂ اہر من بسے ست ہشد اروگوش رابہ پیام سروش دار

''یعنی طریق باطن میں شیطان کے وساوس اور خطرات ہیں ان سے بچنا چاہتے ہوتو ہوشیار رہو اور شریعت کا اتباع کرو''

(۱) کسی بلند مرتبہ کا صرف ذائقہ چکھنے سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ مرتبہ مجھے حاصل ہوگیا۔

''پیام سروش'' سے مراد وحی ہے جس میں قرآن وحدیث وفقہ وتصوف سب داخل ہیں۔قرآن وحدیث تو وحی بلاواسطہ ہے اور فقہ میں اگرچہ قیاس کا واسطہ ہے مگر یہ مسئلہ ثابت ہوچکا ہے کہ القیاس مظھر لا مثبت قیاس مراد کو ظاہر کرتا ہے۔کوئی نیا حکم ثابت نہیں کرتا جو اہل بصیرت ہیں وہ فقہ وتصوف میں وحی کا رنگ دیکھتے ہیں اور یوں کہتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　من انداز قدت رامی شناسم

''خواہ کسی ہی رنگ کا لباس پہن لو میں قد کے انداز سے پہچان لوں گا''

خشیت کی علامت

پس خشیت کے متعلق بھی حدیث وقرآن سے معلوم کرنا چاہیئے کہ شریعت نے حصول خشیت کی علامت کیا بتلائی ہے۔سنیے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:(اسئلك من خشيتك ما تحول به بيني وبين معاصيك) ''میں تجھ سے اتنے خوف کی درخواست کرتا ہوں جو میرے اور میری معاصی کے درمیان حائل ہوجائے''

اس سے معلوم ہوا کہ خشیت مطلوبہ وہ ہے جس سے گناہوں میں حیلولت ہوجائے (۱)۔ پس جس کو یہ حیلولت حاصل نہیں اسے خشیت نہیں تو اس کے پاس علم حاصل ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں جس پر وہ علم کا دعوی کرسکے۔یعنی علم مطلوب گو کتابی علم حاصل ہو مگر شریعت میں جو علم مطلوب ہے وہ یہ کتابی محض نہیں ہے بلکہ علم مطلوب وہ ہے جو دل میں اتر جائے اور اس علم کے لئے خشیت لازم ہے۔

گو اس آیت کا اول نظر میں یہ مدلول نہیں بلکہ اس کا مدلول تو عکس ہے یعنی خشیت کے لیے علم لازم ہے کیونکہ وہ خشیت کا موقوف علیہ ہے اور وجود موقوف علیہ کو تو

(۱) خوف خدا کا اتنا ہی درجہ مطلوب ہے جس کی وجہ سے گناہ سے رک جائے۔

اس آیت سے علم خشیت کے لئے مستلزم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن ایک عمیق تحقیق سے جو کہ ختم بیان کے قریب مذکور ہوگی۔ خود آیت سے بھی اور قطع نظر اس تحقیق کے دوسرے دلائل سے یہ استلزام ثابت ہے کہ اگر خشیت حائلہ بین المعاص وبین المعاصی ''گنہ گار اور گناہوں کے درمیان حائل ہونے والی'' حاصل نہ ہو تو اسے علم مطلوب بھی حاصل نہیں چنانچہ حدیث: لا یزنی الزانی وھو مؤ من (الصحیح للبخاری ۳:۱۷۸)

''کوئی زنا نہیں کرتا اس حال میں کہ وہ مومن ہو''

اس کی دلیل ہے اس طرح سے زنا علامت ہے عدم خشیت کی (۱)۔

علم کا درجہ مطلوب

اور اس سے ایمان کی نفی فرمائی اور ایمان بمعنی تصدیق ایک علم ہے۔ تو جب خشیت کی نفی سے ایمان کی نفی فرمائی تو خشیت کا لازم ہونا اور علم کا ملزوم ہونا ثابت ہوگیا۔ باقی ہر ایک کی نفی سے دوسرے کی جو نفی کا حکم ہے اس کی ذات کی نفی کا حکم نہیں بلکہ اس کے کمال اور درجہ مطلوب اور اس کے بعض آثار کی نفی کا حکم ہے مثلا اس حدیث ہی میں یہ مراد ہے کہ: لا یزنی وفیہ اثر الایمان المطلوب مطلب یہ ہے کہ مومن میں جب تک ایمان کا اثر مطلوب موجود رہے اس وقت تک وہ زنا نہیں کرسکتا اور جس وقت زنا کرے گا اس وقت اس میں یہ اثر مطلوب نہ ہوگا۔ گو نفس ایمان باقی ہے پس اس سے ایمان کی نفی مراد نہیں بلکہ اثر ایمان کی نفی مراد ہے یا بلفظ دیگر جس میں خشیت نہ ہو اس سے مطلق علم کی نفی نہیں کی جاتی بلکہ اثر علم کی نفی کی جاتی ہے اور مطلب شرعی وہی علم ہے جو اپنے اثر کے ساتھ ہو (جیسے تلوار وہی مطلوب ہے جس میں صفت قطع بھی (۲) ہو ورنہ برائے نام تلوار ہوگی ۱۲) تو اس اثر کے انتفاء سے علم مطلوب کی نفی صحیح

(۱) زنا کا ارتکاب اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے (۲) جو کاٹ بھی سکتی ہو۔

ہے خوب سمجھ لو۔ اسی کو کہتے ہیں ۔

علم چہ بود آنکہ رہ بنما یدت زنگ گمراہی زدل بزدایدت

''یعنی علم وہی ہے جو تم کو خدا کا راستہ دکھائے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کرے''

ایں ہو سہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت در دلت افزوں کند

''یعنی حرص وہوا سے چھڑا کر تمہارے دل میں خوف وخشیت پیدا کردے''

تو ندانی جزیجوز ولا یجوز خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

''یعنی تم کو سوائے اس کے کہ یہ چیز جائز ہے اور یہ ناجائز ہے اپنی خبر نہیں کہ تم مقبول ہو یا مردود''

اور جب تمہارے علم کی یہ حالت ہے کہ سوائے یجوز ولا یجوز کے کچھ خبر نہیں اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں تو پھر اسی پر اس خطاب کو بے تکلف مرتب کر سکتے ہیں ۔

ایھا القوم الذی فی المدرسہ کل ما حصلتموہ وسوسہ

''صاحبو! جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا''

علم نبود غیر علم عاشقی ما بقی تلبیس ابلیس شقی

''علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ بدبخت شیطان کی تلبیس ہے''

مگر ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ علم عاشقی سے کیا مراد ہے ۔

علم دیں فقہ ست وتفسیر وحدیث ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

''علم دین فقہ، تفسیر حدیث ہے جو شخص ان کے علاوہ مقصود بالذات حاصل کرے وہ خبیث ہے''۔

علم اور عشق

یہ اس واسطے کہہ دیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ علم عاشقی سے مراد علم دین ہے کیونکہ ایمان ہی عشق ہے، وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ اور جب ایمان عشق ہے تو اسی کا علم علم عاشقی ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ کوئی صاحب علم عاشقی سے مخلوق کا عشق نہ سمجھ جائیں گو وہ بھی اگر حدود کے اندر ہو جس کا حاصل دو امر ہیں ایک بے اختیاری دوسری عفت تو مذموم نہیں بلکہ ایک درجہ میں مفید ہے جس میں تعلیم شیخ کی ضرورت ہے مگر یہاں وہ مراد نہیں کیونکہ یہ عشق مخلوق مطلوب و مقصود نہیں ہے اور یہاں مقصود کا ذکر ہو رہا ہے۔ باقی مطلق عشق کے متعلق ایک حدیث بھی مشہور ہے۔

من عشق فكتم وعف فمات فهو شهيد (اتحاف السادة المتقين ٧:٤٣٩)

''جو عشق میں مبتلا ہو اور اس کو چھپایا اور عفت اختیار کی پس وہ مر گیا وہ شہید ہے''

مگر محدثین نے اس میں کلام کیا ہے بعض نے اس کو موضوع (۱) بھی کہا ہے مگر صاحب مقاصد کی رائے وضع کی نہیں۔ لیکن وضع کی دلیل میں جو یہ کہا ہے کہ لفظ عشق قرآن و حدیث میں کہیں نہیں آیا اس لیئے یہ موضوع ہے یہ وجہ تو صحیح نہیں کہ اس لئے کہ حدیث میں نہ آنا اس شخص کو کہاں مسلم ہے جو اس کو حدیث کہتا ہے۔

دوسرے ممکن ہے کہ اس میں روایت بالمعنی ہوگئی ہو۔ حضور ﷺ کے کلام میں لفظ عشق نہ ہو۔ راوی نے معنی سمجھ کر اس کو بالمعنی نقل کر دیا اور روایت بالمعنی جائز ہے۔ ہاں اگر سند میں کلام ہو تو اور بات ہے۔ یا کسی کا ذوق اسے موضوع بتلاتا ہو گو اس کا ذوق دوسروں پر حجت نہ ہوگا۔ مگر ہم اس سے نزاع نہ کریں گے کیونکہ ذوقیات محل نزاع نہیں ہیں لیکن قواعد سے اس کا مضمون بے اصل نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس میں عشق

(۱) من گھڑت کہا ہے۔

سے مراد وہ عشق عمد نہیں ہے جس کو از خود اپنے سر لگایا جائے جیسا کہ سعدی فرماتے ہیں ؎

سوم باب عشق ست و مستی شور نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

’’تیسرے باب میں عشق اور مستی وشور کا بیان ہے نہ وہ عشق کہ لوگ اپنے اوپر زبردستی مسلط کرتے ہیں‘‘

بلکہ عشق غیر اختیاری مراد ہے جس کا حدوث بھی بے اختیار ہو اور بقاء میں بھی اختیار سے کام نہ لیا گیا ہو اور اس کے ساتھ عفت بھی ہو۔ یعنی نہ قصداً اسے دیکھے نہ قصداً اس کے پاس جائے کیونکہ اس روایت میں فعف (عفت اختیار کی) تحید صراحۃً(۱) موجود ہے اور یہ افعال قصدیہ خلاف عفت ہیں۔ تو اب صرف عشق قلبی غیر اختیاری کا درجہ رہ گیا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مرض ہے جیسا کہ دق ایک مرض ہے اور حمی میں (۲) شہادت کا وعدہ منصوص ہے (نقلہ الشامی عن السیوطی فی ردالمختار (شامی نے اس کو سیوطی سے ردالمختار میں نقل کیا ہے) تو عشق کے لئے بھی اگر شہادت کا وعدہ ہو تو کیا بعید ہے۔ کیونکہ واقعی عشق کا الم دق کے الم سے(۳) بہت زیادہ ہے اس میں اگر عفت وکتمان (۴) سے کام لیا جاوے تو واقعی یہ بڑی ہمت و جوانمردی کا کام ہے اس میں تلوار کی ضرب سے زیادہ ضربیں لگتی ہیں۔ یہ سب کلام تھا عشق مخلوق میں۔

علم مطلوب

لیکن ہر حال میں یہاں علم عاشقی سے یہ عشق مراد نہیں کیونکہ اس عشق کا کوئی علم خاص تھوڑا ہی ہے جس کو حاصل کیا جائے۔ یہ تو امر غیر اختیاری ہے جو اختیار سے

(۱) عفت و پاکدامنی اختیار کرنے کی قید صراحتا موجود ہے (۲) بخار کی حالت میں موت آئے تو درجہ شہادت کا وعدہ ہے (۳) عشق کی تکلیف تپ دق کی تکلیف سے بھی زیادہ ہے (۴) پاکدامنی اختیار کرے اور پوشیدہ رکھے۔

حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور اگر اختیار سے حاصل کیا جائے تو مذموم ہے (۱) ہاں عشق خدا کا علم مراد ہے جو حدیث وقرآن وفقہ میں موجود ہے اس کے غیر کو کہتے ہیں کہ ؎

ما بقی تلبیس ابلیس شقی

''جو باقی رہا وہ بدبخت شیطان کی تلبیس ہے''

مابقی میں کیا رہا۔ شاید آپ کہیں گے کہ یہ منطق وغیرہ ہوگی۔ نہیں صاحب! اگر علوم خادمہ کو بحیثیت خادم کے رکھا جائے تو التابع فی حکم المتبوع (تابع متبوع کے حکم میں ہوتا ہے) کے قاعدے سے وہ بھی علوم دینیہ ہی میں داخل ہیں۔ جیسے بادشاہ کا خادم وغلام اگر اس کے ساتھ ہو تو وہ بھی متبوع کے حکم میں ہوتا ہے کہ جیسے بادشاہ کی خاطر کی جاتی ہے ایسے ہی اس کے تعلق سے غلام کی بھی کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ خادم ہو باغی نہیں۔

پس معقول (۲) سے اگر اثبات دین وفہم شرع میں کام لیا جائے تو یہ بھی دین ہے اور ابطال شرع کا کام لیا جائے تو پھر باغی ہے اور تلبیس ابلیس شقی میں داخل ہے۔

نیز دیکھئے اگر کوئی پوچھے کہ اس کھانے میں کتنی لاگت لگی ہے تو جہاں آٹا اور گھی اور دال کو شمار کرتے ہیں وہیں کھانے کی میزان میں لکڑیاں اپلے بھی شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ حساب میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لکڑیاں چار آنے کی اور اپلے (۳) دو آنے کے۔ تو کیا اب کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحب اپلے کیا کھائے جاتے ہیں جو ان کو کھانے کے حساب میں شمار کیا گیا۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی کہے تو ہر عاقل اس کو یہی جواب دے گا کہ اپلے کھائے تو نہیں جاتے مگر کھانے کی خدمت کرتے ہیں۔

اسی طرح معقول وفلسفہ کو سمجھو کہ اگر ان کو دین کے کام میں صرف کیا جائے تو ان کا وہی حال ہے جو کھانا پکانے میں اپلوں کا حال ہے کہ وہ بھی دین کے ساتھ شمار

(۱) برا ہے (۲) علم منطق وفلسفہ سے اگر دین کو سمجھنے کا کام لیا جائے تو وہ بھی دین (۳) بھینس کے گوبر کی تھاپیاں۔

ہوں گے۔ جیسے اپلے کھانے کے حساب میں شمار ہوتے ہیں اور اگر ان کو دین کے کام میں نہ لگایا جائے بلکہ انہی کو مقصود بنالیا جائے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی اپلے کھانے لگے۔

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ علم مطلوب وہ ہے جس کے ساتھ دل میں اثر بھی ہو اسی کو کہتے ہیں

علم چوں بردل زنی یارے شود　　　علم چوں برتن زنی مارے شود

"علم اگر دل میں اثر کرے وہ معین ہوتا ہے اور علم اگر جسم پر اثر انداز ہو تو وہ سانپ یعنی مہلک ہوتا ہے"

فخر وفضیلت

تو بتلایئے کہ ہمیں جو اپنے علم پر ناز ہے اور خشیت سے خالی ہیں تو یہ ناز بجا ہے یا بے جا(۱)۔

صاحب! پہلے خشیت تو پیدا کرو شاید تم یہ کہو کہ اچھا تو کیا بعد خشیت کے ہم ناز کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ نہیں۔ اس وقت وہ خشیت آپ کے ناز کو مٹادے گی۔ اب شاید تم یہ کہو گے کہ یہ عجیب چکر ہے۔ حصول خشیت کے بعد اس لئے ناز نہ کر سکے کہ خشیت نے اس کو مٹادیا تو اس کے تو معنیٰ یہ ہوئے کہ علم ناز کی چیز ہی نہ رہی۔

نہیں صاحب! حصول خشیت کے بعد علم بہت بڑے ناز کی چیز ہے مگر خود صاحب علم کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے۔ یعنی اس وقت تم ناز نہیں کرو گے بلکہ اس وقت ہم تم پر ناز کریں گے۔

(۱) تو یہ ناز کرنا صحیح ہے یا غلط۔

دیکھو ہمارے مدارس میں ایسے ایسے علماء ہوتے ہیں اس وقت ہم تم پر ناز کریں گے۔ اور صاحب ہم تو کیا ناز کرتے اس وقت بڑے حضرات تم پر ناز کریں گے یعنی انبیاء علیہم السلام۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔

تناکحو توالدو فانی اباھی بکم الامم (الاسرار المرفوعة لعلی القاری: ١٦٧)

''یعنی نکاح کرو بچے پیدا کرو۔ اسی لئے میں تمہاری (کثرت کی) وجہ سے دوسری امتوں کے مقابلہ میں فخر کروں گا''

حضور ﷺ کو آپ پر فخر ہوگا کہ میری امت میں ایسے ایسے لوگ ہیں تو کیا تھوڑی بات ہے۔ اب تمہیں بتلاؤ کہ تم خود ناز کرو یہ اچھا ہے یا انبیاء واولیاء تم پر ناز کریں یہ اچھا ہے۔ یقیناً دوسری ہی صورت ارفع ہے تو اب تو یہ شبہ جاتا رہا کہ علم ناز کی چیز ہی نہیں رہی اور یہیں سے اشکال رفع ہوگیا کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

او خدو انداخت بروئے علی افتخار ہر نبی و ہر ولی

''اس نے تھوک ڈالا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک پر جو ہر نبی اور ولی کے افتخار ہیں''

اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افتخار ہر نبی کیوں کر کہہ دیا جواب یہ ہے کہ اس کا مطلب وہی ہے جو اس حدیث کا مطلب ہے اباھی بکم الامم ''میں تمہاری وجہ سے تمام امتوں پر فخر کروں گا'' یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فخر کریں گے۔ اور اس سے حضرت علی کی تفضیل انبیاء لازم نہیں آتی۔ کیونکہ افتخار کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو چھوٹوں کو بڑوں پر ہوتا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ کامل کی طرف انتساب سے ناقصوں کو فضیلت حاصل ہوتی ہے اور ایک افتخار بڑوں کو چھوٹوں پر ہوتا ہے کہ ہمارے سلسلہ میں یا ہمارے فیض یافتہ ایسے ایسے ہیں۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ

افتخار ہر ولی بمعنی اول ہیں اور افتخار ہر نبی بمعنی ثانی ہیں۔

غرض حصول خشیت کے بعد اساتذہ ہم پر فخر کریں گے۔ ہم کو اس وقت بھی ناز کا حق نہ ہوگا۔ تو جب حصولِ خشیت کے بعد بھی ہم کو ناز کا حق نہ ہوگا تو حصول سے پہلے تو کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ ایسا علم جو خشیت سے خالی ہو علم ہی نہیں۔ اس میں ناز کا احتمال ہی نہیں نہ تم کو اور نہ تم پر۔

صاحبو! علم کو میراث انبیاء کہا جاتا ہے تو اب دیکھ لو کہ انبیاء کی میراث کون سا علم ہے۔

میراث پدر خواہی علم پدر آموز

''باپ کی میراث چاہتے ہو تو باپ کا علم سیکھو''

کیا انبیاء کا علم بھی ایسا ہی تھا۔ نعوذ باللہ جس میں محض مسائل واصطلاحت کا حفظ ہو اور خشیت کا نام نہ ہو۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہاں تو یہ حالت تھی کہ جتنا علم بڑھتا تھا اسی قدر خشیت بڑھتی تھی۔ حدیث میں ہے۔

اعلمکم باللہ ھواخشاکم للہ (الکاف الشاف فی تخریج احادیث الکشاف: ۱۳۹)

''تم سے زیادہ اللہ کو جاننے والا اور تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں''

پس معلوم ہوا کہ علم خود مقصود نہیں بلکہ خشیت کے لئے مقصود ہے۔

خشیت مطلوبہ

مگر اب ہماری یہ حالت ہے کہ علم حاصل کرتے ہیں پھر پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ تحصیل خشیت کا اہتمام نہیں کرتے حالانکہ غیر مقصود کو مقصود بنالینا مکروہ ہے۔ فقہاء نے اس راز کو خوب سمجھا ہے فرماتے ہیں کہ وضو

سے جب تک نماز نہ پڑھی جاوے اس وقت تک دوسرا وضو مکروہ ہے۔ ظاہر میں تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ فقہاء نے ایک عبادت کو منع کیا ہے۔ مگر یہ لوگ حکماء امت ہیں واقعی خوب سمجھے کہ جب اس نے غیر مقصود کو ادائے مقصود سے پہلے مکرر کیا تو اس نے غیر مقصود کو مقصود بنالیا اور یہ حد سے تجاوز ہے۔ اسی طرح تعلم و تعلیم کو مقصود بالذات سمجھ لینا بھی حد سے تجاوز ہے۔

حصول خشیت کی فرصت نہیں کا جواب

اب بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب ہم کو تحصیل خشیت کی فرصت نہیں۔ یہ جواب ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے حجام کو خط دیا کہ جلدی سے فلاں شخص کو پہنچا دو۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور لا کر خط اس کے حوالہ کیا۔ اس نے کھول کر دیکھا تو اندر کورا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پوچھا کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں لکھا محض سادہ کاغذ ہے۔ کہا صاحب کو لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ جلدی میں بھیج دیا۔ کہا پھر زبانی کچھ کہا تھا۔ کہنے لگا حضور میں تو عرض کر چکا ہوں کہ جلدی بہت تھی۔ اس لئے زبانی بھی کچھ نہیں کہا بہت ہی جلدی تھی اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ زبانی کچھ کہتے۔ اس نے کہا کہ پھر بے وقوف کو قاصد بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔

تو ایسا ہی یہ آپ کا جواب ہے کہ ہم کو حصول خشیت کی فرصت نہیں تو غیر مقصود کے لیے فرصت نکالنے سے کیا حاصل ہوا۔

صرف کتابیں پڑھنے سے خشیت حاصل نہیں ہوگی

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ کتابیں پڑھ لینے سے خشیت بھی خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ مستقل طور پر اس کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ محض کتابیں پڑھنے سے جو خشیت حاصل ہوتی ہے اس کی ایسی حالت ہے جیسے ایک منہار چوڑیوں کی گٹھڑی باندھے ہوئے لیے جارہا تھا۔ ایک گاؤں والا ملا اور اس میں لاٹھی کا کھودا مار کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے۔ (دیہاتیوں کی عادت ہے کہ یہ لاٹھی ہی سے بات کیا کرتے ہیں ۱۲) منہار نے [1] جواب دیا کہ اس میں ایسی چیز ہے کہ ایک کھودا[2] اور اس میں مار دو تو کچھ بھی نہیں۔

ایسی ہی وہ خشیت ہے جو کتابیں پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے کہ شیطان کی ذرا سی ٹھیس سے شکستہ ہوجاتی ہے اور دوسری ٹھیس میں کچھ بھی نہیں رہتی۔ اور خشیت مطلوبہ وہ ہے جو معاصی سے جواب ہوجائے۔ جو شیطان کی ہزار ٹھیس لگانے سے بھی شکستہ نہ ہو۔

اب تو معلوم ہوگیا کہ تحصیل علم کے بعد تحصیل خشیت کی مستقل طور پر ضرورت ہے تاکہ اس کو استحکام ہوجائے مگر آجکل اہل علم اسی کی جڑیں کھوکھلی کررہے ہیں۔ خانقاہ والوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کو نکما اور بےکار بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وقت خانقاہوں میں بیٹھنے کا نہیں ان کو بند کردو۔

سبحان اللہ! جو درس گاہ اصل مقصود کی تعلیم کے لئے موضوع ہے وہ تو بیکار ہوجائے۔ اور جو درسگاہ غیر مقصود کی تعلیم کے لئے ہیں وہ بےکار نہ ہوں ۱۲)

میرے بیان کا حاصل یہ تھا کہ جس کو تم مقصود بالذات سمجھ رہے ہو یعنی تعلیم و تعلم وہ مقصود بالذات نہیں ہے محض طریق ہے اور مقصود بالذات دوسری چیز ہے یعنی وہ علم ہے جس سے خشیت ہو۔

عوام کی تعلیم

اب میں تنزل کرکے کہتا ہوں کہ اچھا تم جس تعلیم کو مقصود بالذات سمجھ رہے

(۱) چوڑیاں بیچنے والا (۲) ایک ڈنڈا۔

ہو یہ تو بتلاؤ کہ اسی کا کیا حق ادا کررہے ہو۔ چنانچہ میں پوچھتا ہوں کہ تعلیم کس کی مقصود ہے تم کہو گے طلباء کی۔ میں کہوں گا کہ تم نے اس مقصود کو بھی پورا نہیں کیا کیونکہ طلباء کی دو قسمیں ہیں۔ خواص اور عوام۔ اس کی کیا وجہ کہ تم صرف خواص کو تعلیم دیتے ہو عوام نے آخر کیا خطاء کی ہے۔ ان کو آپ کیوں نہیں پڑھاتے۔ شاید تم یہ کہو گے کہ صاحب یہ عوام میزان منشعب کیسے پڑھیں گے۔ ان کو تو الف با کی بھی خبر نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ عوام کی میزان دوسری ہے تم عوام کو ان کی میزان پڑھاؤ۔ یعنی ان کو کلمہ سکھلاؤ۔ پاکی ناپاکی کا طریقہ بتلاؤ۔ نماز سکھلاؤ اور ضروری ضروری احکام سناؤ۔ اور جو ان میں اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں ان کو دینیات کے اردو رسائل پڑھاؤ۔ مگر اردو ہی میں پڑھانا ولایتی زبان میں تقریر نہ کرنا کیونکہ بعضے مولویوں کو اردو میں بھی عربی لغات کے ٹھوسنے کا مرض ہوتا ہے۔

لکھنؤ میں ایک بزرگ زمیندار تھے۔ ان کے پاس گاؤں کے کاشت کار آئے تو مولوی صاحب ان سے پوچھتے ہیں کہ امسال تمہارے کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں (۱)۔ یہ گاؤں والے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کی یہ بات سن کر ایک نے دوسرے سے کہا۔ بھائی مولوی جی ابھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اب چلو جب آدمیوں کی سی بولی بولیں گے۔ اس وقت آجائیں گے۔

اسی طرح مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے تھے کہ دہلی میں ایک مدرس معقولات (۲) سے لوگوں نے وعظ کی درخواست کی آپ وعظ کہنے بیٹھے کہ حق تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا انعام ہے کہ ہم کو لیس سے ایس میں لائے (۳)۔ اور پھر وہ ہم کو ایس سے لیس میں لے جائیں گے اور اس کے بعد قیامت میں پھر لیس سے

(۱) اس سال گندم کی فصل پر بارش ہوئی کہ نہیں (۲) منطق پڑھانے والے مدرس (۳) ہمارا وجود نہیں تھا پھر وجود دیا۔ پھر اس وجود کو ختم کردیں گے پھر قیامت میں وجود عطا فرمائیں گے۔

ایس میں لے آئیں گے۔ بندۂ خدا نے سارا وقت ایس اور لیس ہی میں گزار دیا۔ تو خدا کے واسطے ایسی ولائتی زبان میں وعظ نہ کہنا بلکہ روز مرہ کی بول چال میں عوام کو احکام سمجھاؤ۔

ضرورت وعظ

افسوس ہے کہ مولویوں نے وعظ کہنا بالکل چھوڑ دیا اور غضب یہ ہے کہ بعضے تو یہ سمجھتے ہیں کہ وعظ کہنا جاہلوں کا کام ہے علماء کا کام فتویٰ دینا اور پڑھنا پڑھانا ہے۔

صاحبو! ذرا زبان سنبھالیئے یہ بات بہت دور تک پہنچتی ہے میں پوچھتا ہوں کہ اب تک جتنے انبیاء گزرے ہیں ان میں کتنے ایسے تھے جو کتابیں پڑھاتے تھے ان شاء اللہ ایک نبی کو بھی آپ ایسا نہ پائیں گے۔ بلکہ انبیاء کا طریقہ وعظ ونصیحت ہی کے طریقہ سے تبلیغ کرنا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ پڑھنا پڑھانا بیکار ہے اس کی ضرورت میں ابھی بیان کروں گا مگر اس وقت میں ان صاحبو کا جواب دے رہا ہوں جو وعظ کو فضول اور بیکار سمجھتے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام یہی تھا۔ آپ کو یہی طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیئے عوام کی تعلیم اسی طرح ہوسکتی ہے سب کو میزان منشعب پڑھنے کی فرصت نہیں ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب وعظ سے اثر نہیں ہوتا اس لئے بے کار ہے اور درس وتدریس پر نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس لئے ہم بجائے وعظ کے درس میں مشغول ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اثر پہنچانے کے مکلّف نہیں ہیں۔ آپ اپنا کام کیجئے اثر خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جس کو وہ نفع دینا چاہیں گے اسے خود متاثر کردیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

نوحؑ نہ صد سال دعوت می نمود　　دمبدم انکار قومش می فزود

’’ نوح علیہ السلام نوسو برس تک تبلیغ کرتے رہے مگر دمبدم ان کی قوم کا انکار بڑھتا ہی رہا‘‘

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو وعظ ونصیحت سے سمجھایا اور ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا مگر نوح علیہ السلام اتنی میں بھی نہ گھبرائے اور آپ چار ہی دن میں گھبرا گئے۔

اب تو ہمارے بھائی یہ کرنے لگے ہیں کہ جو کام ان کے قابو سے باہر ہو اس میں تو کوشش کرتے ہیں۔ سلطنت حاصل کرنے کے لئے بڑی لمبی چوڑی تجویزیں کرتے ہیں۔ اس میں روپیہ بھی خرچ کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں کامیابی مظنون تو کیا موہوم بھی نہیں (۱)۔ اور دین کے بارے میں کچھ کوشش نہیں کرتے جس میں کوشش کرنے سے کامیابی کا بھی وعدہ ہے اور اگر دنیا میں نہ ہو تو آخرت میں یقینی۔ اور یہ کام ان کے قابو کا بھی ہے۔

مثلاً آج کل ہمارے بہت سے ناواقف بھائی مسلمان جن کو ہم نے اپنی برادری سے الگ کر رکھا تھا۔ اور اب تک ان سے غافل تھے۔ دشمن ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اسلام سے مرتد کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت بڑا کام دین کا یہ ہے کہ ان کو جا کر سمجھایا جائے اور وعظ ونصیحت کے طریقہ سے اسلام کی خوبیاں ان کے کانوں میں ڈالی جائیں تاکہ وہ دشمنوں کے فریب سے محفوظ رہیں۔ مگر چونکہ یہ کام خالص دین کا ہے اس میں سلطنت ملنے کی کچھ توقع نہیں اس لیئے ہمارے بہت سے بھائی اس کام کو فضول سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض تو مضر کہتے ہیں کہ صاحب اس وقت تبلیغ کرنا مصالح کے خلاف ہے۔

ارے میں کہتا ہوں کہ تم اپنی مصالح کو پیس دو۔ مصالحہ کو جتنا پیسو گے۔ اتنا ہی

(۱) کامیابی حاصل ہونے کا گمان تو کیا وہم بھی نہیں۔

عمدہ کھانا ہوگا۔ کیسا مسالہ لیے پھرتے ہو۔ غذا کا اہتمام کرو فضول کام میں نہ لگو۔ اس وقت وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے ان ناواقف مسلمانوں میں تبلیغ کی سخت ضرورت ہے۔ سب مسلمانوں کو مل کر یہ کام کرنا چاہیئے۔

دولت علم

یہ کام اصل میں تو علماء کا ہے مگر علماء کی حالت یہ ہے کہ ان کے پاس مال نہیں اور نہ ان کو مال کی ضرورت ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فیصلہ کر چکے ہیں ۔

رضینا قسمة الجبار فینا　　لنا علم وللجهال مال

کہ ہم حق تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہم کو علم دیا جائے اور جہّال کو مال۔ شاید اس پر کوئی صاحب یہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ تقسیم کیسی کی کہ خالی علم پر راضی ہوگئے۔ کچھ علماء کے لئے مال کا بھی تو حصہ رکھ لیتے یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ پر بعض لوگوں نے کیا تھا۔ جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد قائم ہوئی تو بعض لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ کالج علیگڑھ کے تعلیم یافتہ تو سرکاری عہدے حاصل کریں گے۔ یہ دیوبند کے پڑھے ہوئے کیا کر کے کھائیں گے یہ اعتراض سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ مدرسہ دیوبند کے طلباء کے واسطے معاش کا کچھ انتظام کر دیا جائے وہاں سے بذریعہ الہام کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اس مدرسہ کا کوئی تعلیم یافتہ کم از کم دس روپے ماہوار سے محروم نہ رہے گا۔ اتنی آمدنی اس کو ضرور ملے گی۔

مولانا بہت خوش ہوئے اور اپنے مجمع میں اس الہام کو بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ نے اس مدرسہ کے طلباء کے لئے کم از کم دس روپے ماہوار کا ذمہ لے لیا ہے۔ بس اب یہاں کا پڑھا ہوا بھوکا نہ رہے گا۔ اس کو سن کر ایک مولوی صاحب نے کہا کہ واہ مولانا

سستے ہی راضی ہو گئے۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد پر بھی شاید کسی کو شبہ ہو کہ آپ بھی سستے ہی راضی ہو گئے کہ بس ہمارے لئے علم ہے اور جاہلوں کے لئے مال ہے ہم اس پر راضی ہیں تو صاحب جس شخص کو علم کی قدر معلوم ہے وہ تو اس تقسیم پر ضرور راضی ہوگا کیونکہ یہ ایسی دولت ہے جس کے سامنے ہفت اقلیم بھی کوئی چیز نہیں ۔

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم　　　　شہان بے کمر وخسرواں بے کلہ اند

''گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تخت و تاج ہیں''

میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں علاوہ رضاء حق کے لذت بھی ایسی ہے کہ جب کوئی علم جدید حاصل ہوتا ہے تو ایسی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ سلاطین کو عمر بھر بھی نصیب نہیں ہوتی اسی لئے کہتے ہیں ۔

در سفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید
کایں حریفاں خدمت جام جہاں بیں کردہ اند

''مٹی کے پیالہ میں رندوں کو ذلت سے مت دیکھو اس لئے کہ انہوں نے جام جہاں بیں کی خدمت کی ہے''

بہرحال اہل علم کے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ دور دراز سفر کر کے جائیں اور اتنی مدت کے لئے اہل وعیال کو نفقہ دے جائیں۔

تبلیغ کی صورت

تو اب تبلیغ کی صورت یہ ہے کہ جن مسلمانوں کے پاس مال ہے وہ مال جمع کریں اور علماء سے کہیں کہ سفر خرچ اور اہل وعیال کے نفقہ کا اس رقم سے انتظام کیجئے اور

تبلیغ کے لئے جائیے مگر آجکل تو حالت یہ ہے کہ دین کا جو کام ضروری ہو وہ بھی سب مولویوں کے ذمہ اور جو الزام ہو وہ بھی سب ان پر جیسے انوری نے کہا ہے۔

ہر بلائے کز آسماں آید گرچہ بر دیگر قضا باشد
برزمیں نارسیدہ پرسد خانۂ انوری کجا باشد

''جو بلا آسماں سے نازل ہوئی ہے اگرچہ دوسرے ہی پر مقدر ہو بغیر زمین پر پہنچے ہوئے دریافت کرتی ہے کہ انوری کا گھر کہاں ہے''

اور میں کہتا ہوں کہ خانۂ مولوی کجا باشد (مولوی کا گھر کہاں ہے)

چنانچہ اس تبلیغ ہی کے بارے میں عام طور سے اخباروں میں لکھا جاتا ہے اور زبان سے بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کی غفلت کا یہ نتیجہ ہے کہ آج اتنے مسلمان مرتد ہوگئے اور اتنے مسلمان احکام سے بالکل ناواقف ہیں۔ علماء نے ان کی بالکل خبر نہیں لی۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ واقعی ان مسلمانوں کی خبر لینا چاہیئے تو ہر شخص یہ کہہ کر الگ ہوجاتا ہے کہ یہ کام مولویوں کا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جیسے ان مسلمانوں سے بے خبری کا الزام آپ نے مولویوں پر رکھا ہے کچھ آپ کا بھی اس میں قصور ہے یا نہیں۔ صاحب مولوی اتنا ہی تو کرسکتے ہیں کہ ان لوگوں کو جا کر سمجھادیں۔ مگر یہ تو بتلائیے کہ مولوی جائیں کیونکر ریل کا کرایہ کہاں سے لائیں اور جتنے دن تک تبلیغ میں رہیں اس زمانہ کے لئے اہل وعیال کو خرچ کہاں سے دیں۔

اس کی صورت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ آپ روپیہ دیں اور یہ سفر کریں۔ باقی یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ چلیں بھی یہی اور لدیں بھی یہی اور گھر والوں کو بھوکا ماریں بھی یہی۔ افسوس یہ ہے کہ آج کل عوام اور رؤسا سوائے رائے دینے کے اور کچھ نہیں کرتے پس جہاں کوئی ضرورت پیش آئی یہ اتنا کہہ کر الگ ہوگئے کہ علماء کو یوں کرنا چاہیئے۔ اس

طرح کرنا چاہیئے اور جب پوچھا جاتا ہے کہ علماء یہ کام کیوں کر کریں۔ اس کے لئے روپے کی ضرورت ہے تو اس وقت سب خاموش ہوجاتے ہیں۔

صاحبو! کام کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے چندہ جمع کر کے رقم کا انتظام کر کے پھر مولویوں سے کہو کہ مولانا تبلیغ کے لئے ہمارے پاس اتنا روپیہ جمع ہے آپ کوئی مبلغ ہم کو دیں۔ پھر اگر وہ کام کرنے والا نہ دیں تو بیشک ان کا قصور ہے۔

چندہ اور علماء

باقی یہ نہیں ہوسکتا کہ مولوی ہی کام کریں اور وہی روپیہ کا انتظام کریں۔ علماء کو تو کسی کام کے لئے چندہ بھی نہ کرنا چاہیئے اے علماء خدا کے لئے تم چندہ کرنا چھوڑ دو۔ تمہارے منہ سے تو چندہ کا لفظ اچھا لگتا ہی نہیں۔ بس تمہاری زبان سے یہ اچھا لگتا ہے۔ ﴿وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ”میں تم سے اس تبلیغ پر مال نہیں مانگتا ہوں اور نہ اس پر تم سے اجرت طلب کرتا ہوں۔ میری اجرت تو اللہ رب العالمین ہی کے ذمہ ہے“

علماء چندہ مانگنے سے احتراز کریں

اس چندہ کی بدولت لوگ علماء سے بھاگنے لگے ان کی صورت سے بھی ڈرنے لگے۔

چنانچہ ایک سب جج صاحب جن کا لباس مولویانہ ہوتا تھا کسی نئی جگہ بدل کر گئے اور محض خوش اخلاقی کے سبب کسی رئیس سے ملنے گئے تو وہ ان کو دیکھ کر گھر میں گھس گئے۔ بعد میں نوکر نے اطلاع دی کہ سب جج صاحب آپ سے ملنے کو آئے ہیں۔ تب وہ باہر آئے اور کہا معاف فرمائیے گا۔ میں آپ کے لباس سے یہ سمجھا کہ کوئی مولوی

صاحب چندہ مانگنے آئے ہیں۔

واقعی آج کل کوئی مولوی کسی رئیس سے ملنے جاتا ہے تو اس کو اول یہ خیال آتا ہے کہ شاید چندہ کا سوال ہوگا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ علماء یہ کام ہرگز نہ کریں بلکہ رؤسا عوام خود چندہ کریں اور مولویوں سے دین کا کام لیں۔

مگر آج کل تو علماء کی مثال ڈوم کے ہاتھی جیسی ہو رہی ہے کہ اکبر نے ایک ڈوم کو انعام میں ہاتھی دے دیا تھا۔ وہ بڑا گھبرایا کہ اس کا خرچ میں کہاں سے لاؤں گا۔ آخر ایک دن اکبر کی سواری نکلنے والی تھی آپ نے ہاتھی کے گلے میں ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا۔ اکبر نے دیکھا کہ شاہی ہاتھی گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے پھر رہا ہے پوچھا یہ کیا قصہ ہے ڈوم کو بلایا گیا کہ تم نے اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول کیوں ڈالا ہے کہا حضور! آپ نے مجھے ہاتھی تو دیدیا اب میں اسے کھلاتا پلاتا کہاں سے۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی میں تو گا بجا کر کھاتا ہوں تو بھی گلے میں ڈھول ڈال کر گا بجا کر اپنا پیٹ پھر لے۔ اکبر ہنس پڑا اور ڈوم کو اس کی مدد کے لئے بھی عطا فرمایا۔

یہی حال آج کل مولویوں کا ہے کہ لوگوں نے ان کے گلے میں ڈھول ڈال دیا ہے کہ جاؤ گاؤ بجاؤ اور روپیہ جمع کر کے خود ہی سب کام کرو۔ یاد رکھو ایک جماعت سے دو کام نہیں ہوسکتے کام کا طریقہ یہی ہے کہ روپیہ تم خود جمع کرو اور مولویوں سے صرف دین کا کام لو۔ بلکہ روپیہ جمع کر کے اپنے ہی پاس رکھو۔ علماء کو روپیہ دو بھی نہیں۔ کیونکہ آج کل بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو واقع میں مولوی نہیں تھے مگر مولویوں میں جا گھسے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے چندوں میں بہت خیانتیں کی ہیں جس سے مولوی بدنام ہوگئے۔

حصول چندہ کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے

اس لیئے میری رائے یہ ہے کہ رؤسا چندہ کر کے اپنے ہی پاس رکھیں مولویوں کو نہ دیں۔ کیونکہ اس سے علماء پر دھبہ آتا ہے۔تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ آپ کے علماء بدنام ہوں۔ ہرگز نہیں۔آپ کو تو چاہیئے کہ اگر علماء چندہ کرنا بھی چاہیں تو آپ ان کو خود روکیں کہ یہ کام آپ کے مناسب نہیں یہ کام ہم خود کریں گے۔

بلکہ ایک صورت سب سے اچھی یہ ہے کہ ایک ایک رئیس ایک مبلغ کی تنخواہ اپنے ذمہ کر لے۔اس میں کسی جھگڑے ہی کی ضرورت نہیں۔اور اگر ایک آدمی ایک مبلغ کی تنخواہ نہ دے سکے تو دو چار مل کر ایک مبلغ رکھ لیں اور اس کا حساب اپنے پاس رکھیں۔ یہ صورت تو روپیہ کے انتظام کی ہے۔

تبلیغ کا قاعدہ

رہا تبلیغ کا قاعدہ اور طریقہ، یہ علماء کی رائے سے ہونا چاہیئے تم روپیہ جمع کر کے علماء سے طریقہ پوچھو اور مبلغ بھی انہی کی رائے سے مقرر کرو۔اس مشورہ کے لئے ایک کمیٹی بناؤ۔علماء کو اس میں مشورہ اور رائے دینے سے انکار نہ ہوگا اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس سے انکار نہ کریں۔ پھر اس طرح اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ان شاء اللہ بہت جلد کامیابی ہوگی۔ گو اول معمولی دقتیں بھی پیش آئیں گی مگر دقت سے نہ گھبرائیں۔ پیادہ سفر کرنے کی تو ضرورت نہیں۔سواری میں سفر کریں ۔ جہاں ریل ہو وہاں ریل سے پہنچیں ورنہ گاڑی بہلی سے جائیں باقی فٹن اور موٹر کی ضرورت نہیں نہ لیمن اور برف کی ضرورت ہے مبلغوں کو ان فضولیات میں قوم کا روپیہ برباد نہ کرنا چاہیئے ۔آپ کا تو یہ رنگ ہونا چاہیئے ۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

''اے دل یہی بہتر ہے کہ عشق الٰہی میں مٹ جاؤ۔ بے زر و مال سے حشمت و دبدبہ میں قاروں (دنیاداروں) سے بہت بڑھ جاؤ۔ لیلیٰ (محبوب حقیقی) کی راہ میں جان کو سینکڑوں خطرات ہیں۔ اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ مجنوں بنو''

آپ کو تو رضاء محبوب کے لئے محبت و عشق کے ساتھ کام کرنا چاہیئے پھر عشاق بھی کہیں فٹن اور موٹر کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔ ان کو تو رضاء محبوب کے لئے مشقتیں بھی آسان ہو جاتی ہیں یہ ہے کام کا طریقہ۔

مگر جو کام شروع کرو، دوام و استقلال کے ساتھ ہونا چاہیئے اس لئے سب واعظ و مبلغ بھی نہ بنیں کیونکہ واعظ بننے کی جڑ تعلیم و تدریس اور مدارس عربیہ ہی ہیں اگر سارے واعظ ہی ہو گئے۔ اور مدارس بند کر دیئے گئے تو پھر ان واعظوں کے مر جانے پر آئندہ کے لئے واعظ کہاں سے آئیں گے۔

کام کرنے کا طریقہ

آج کل مسلمانوں میں یہ بھی مرض ہے کہ جس کام کو شروع کرتے ہیں سب کے سب اسی کام میں لگ جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے چنانچہ ایک دفعہ جہاد کے لئے سب لوگ چل پڑے تھے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ ﴾ کہ سب مسلمانوں کو ایک دم سے جہاد کے واسطے نہ جانا چاہیئے تھا۔ بلکہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی سی جماعت تفقہ فی الدین کے لئے بھی رہنی چاہیئے تھی۔

صاحبو! یہ ہے شریعت معتدلہ کہ ہر کام کے لئے ایک خاص جماعت ہونا چاہیئے۔ سب کے سب ایک ہی کام میں نہ لگیں۔ غرض ایک جماعت تعلیم و تدریس میں مشغول ہو اور ایک جماعت وعظ و تبلیغ میں مشغول ہو۔ پھر اگر تم سے توکل ہو سکے تو پھر کسی کا انتظار نہ کرو۔ خدا پر بھروسہ کر کے چل کھڑے ہو۔ ان شاء اللہ وہ تمہاری ضروریات کو پورا کر دیں گے۔ اور توکل نہ ہو سکے تو اپنے شغل و معاش میں لگ کر جتنا کام تبلیغ کا کر سکو اتنا ہی کرو۔ مثلاً اپنے محلّہ میں وعظ کہو۔ اور گاہے گاہے آس پاس وعظ کہا کرو۔ علماء نے یہ کام آج کل بالکل چھوڑ دیا جو انبیاء کا کام تھا۔ اسی لیئے آج کل واعظ جہلاء زیادہ نظر آتے ہیں علماء واعظ بہت کم ہیں تو اپنے اصل مقصود کے علاوہ جس چیز کو مقصود بنا دیا تھا اس کی بھی تکمیل نہیں کی اس کا بھی ایک شعبہ لے لیا۔ یعنی تعلیم درسیات اور دوسرا شعبہ عوام کا چھوڑ دیا۔

صاحبو! اگر علماء عوام کی تعلیم نہ کریں گے تو کیا جہلاء کریں گے اگر جہلاء یہ کام کریں گے تو وہی ہوگا جو حدیث میں۔

اتخذوا رؤسا جهالا فضلوا واضلو

''جہلاء کو انہوں نے پیشوا مقتدا بنالیا ہے خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا''

کہ یہ جہلاء مقتدا و پیشوا شمار ہونگے۔ لوگ انہی سے فتویٰ پوچھیں گے اور یہ جاہل خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے اس لئے علماء کو تعلیم درسیات کی طرح وعظ و تبلیغ کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور اس کا انتظار نہ کرو کہ ہمارے وعظ کا اثر ہوتا ہے یا نہیں اور کوئی سنتا بھی ہے یا نہیں اور سننے والا ایک ہے یا مجمع ہے۔

وعظ کہنے والوں کو نصیحت

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ آپ نے مسجد

میں وعظ فرمایا ختم وعظ پر ایک شخص آیا۔ اس نے آہ بھر کر کہا کہ افسوس میں بہت دور سے وعظ سننے آیا تھا۔ یہاں ختم بھی ہولیا۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی تم افسوس نہ کرو۔ آؤ میں تم کو سارا وعظ دوبارہ سنادوں گا۔ چنانچہ آپ نے اس کے سامنے سارا وعظ دہرایا۔

صاحب! اخلاص کے بعد اس پر نظر نہیں ہوا کرتی کہ سننے والے کتنے ہیں اگر ایک بھی سننے والا ہو تو غنیمت سمجھو۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو سید صاحب بریلوی کے خلفاء ہیں ان کو سید صاحب نے حکم دیا تھا کہ وعظ کہا کرو۔ انہوں نے عرض کیا کہ سنے گا کون؟ سید صاحب نے فرمایا تم دیوار کی طرف منہ کرلیا کرو اور سامعین کو دیکھا ہی مت کرو تاکہ مجمع کا ہونا نہ ہونا معلوم ہی نہ ہو اول اول یونہی وعظ کہتے رہے پھر تو یہ حالت تھی کہ لوگ دور دور سے آپ کے وعظ کے اشتیاق میں اس کثرت سے آتے تھے کہ جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ پس مجمع کے کم وبیش ہونے پر نظر نہ کرو کام شروع کردو پھر اثر بھی ہونے لگے گا۔ یہ تو اسی علم کی تکمیل کا طریقہ تھا جو مقصود بالغیر ہے۔

علم مقصودہ کے حصول کا طریقہ

باقی اور اصل مقصودہ علم ہے جس کے ساتھ قلب میں خشیت بھی پیدا ہو۔ اس کا حاصل کرنا بھی ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے۔ مگر عادتاً یہ بدوں صحبت شیخ کے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے قال وقیل کو کچھ دنوں کے لئے ترک کرنا اور کسی شیخ کی جوتیاں سیدھی کرنا شرط ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ۔

از قال وقیل مدرسہ حالے ولم گرفت حالے امالہ ہے حالا کا
از قال وقیل مدرسہ حالے ولم گرفت یک چند نیز خدمت معشوق می کنم

''مدرسہ کے قیل وقال سے اب میرا دل رنجیدہ ہوگیا۔ اب کچھ دنوں شیخ کامل کی خدمت کرتا ہوں''

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

''یعنی قال کو چھوڑو حال پیدا کرو۔ یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑ جاؤ''

مگر اس میں ایک ترتیب بھی ہے اور وہ ترتیب ہر شخص کے لئے جدا ہے اس کو میں اس مجلس میں بیان نہیں کرسکتا۔ اس کو صحبت شیخ پر رکھو جب تم کسی سے رجوع کرو وہ خود ترتیب بتلادے گا۔

ایک علمی اشکال

اب میں ایک طالبعلمانہ اشکال کا جواب دینا چاہتا ہوں جو اس آیت پر وارد ہوتا ہے۔ یہ جواب ابھی کوئی دس بارہ دن ہوئے قلب پر وارد ہوا ہے اس سے پہلے اس کی طرف ذہن نہیں گیا۔ اشکال کا حاصل یہ ہے کہ میں نے تو اب تک خشیت کو لوازم علم سے کہا تھا کہ علم جب ہوگا خشیت ضرور ہوگی اور انتفاء خشیت انتفاء علم کی دلیل ہے (۱) کیونکہ انتفاء لازم سے انتفاء ملزوم ضروری ہے مگر آیت کے الفاظ اس کو مفید نہیں کیونکہ ﴿اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا﴾ ''اللہ تعالیٰ سے عالم ہی اس کے بندوں میں سے ڈرا کرتے ہیں''

میں ''انما'' لفظ حصر ہے جس سے یہ معنی حاصل ہوئے کہ خشیت من اللہ علماء میں منحصر ہے یعنی جہلاء کو خشیت نہیں ہوتی۔ (کیونکہ بقاعدہ بلاغت یہاں قصر صفت علی الموصوف ہے جیسے انما یقوم زیدٌ اور انما یتذکر اولو الالباب میں کہ مثال اول

(۱) خشیت کے نہ ہونے سے علم کا نہ ہونا لازم آتا ہے۔

میں قیام زید کا اثبات اور اس کے ماسوا کی نفی ہے کہ عمرو بکر وغیرہ قائم نہیں ہیں اور مثال ثانی میں تذکر کا عقلاء کے لئے اثبات ہے اور غیر عقلاء سے تذکر کی نفی ہے۱۲)۔

حاصل جس کو یہ ہو کہ خشیت علم کے بغیر نہیں ہوتی یعنی خشیت کے لئے علم شرط ہے علت نہیں۔ اور وجود مشروط لازم نہیں۔ ہاں انتفاء شرط سے مشروط معدوم و منتفی ہوجاتا ہے(۱) اور علت میں اس کا عکس ہے کہ وجود علت سے وجود معلول ضروری ہے(۲) اور انتفاء علت میں اس کا عکس ہے کہ وجود علت سے وجود معلول ضروری ہے اور انتفاء علت سے انتفاء معلول لازم نہیں(۳)۔ ممکن ہے کہ کسی دوسری علت سے اس کا وجود ہوگیا ہو۔ معلول واحد کے لئے علل متعددہ ہوسکتی ہیں(۴) تو مطلب یہ ہوا کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے۔ باقی یہ لازم نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں خشیت بھی ضرور ہو تو آیت سے یہ ثابت نہ ہوا کہ علم خشیت کو مستلزم ہے بلکہ یہ ثابت ہوا کہ خشیت علم کو مستلزم ہے کیونکہ وجود مشروط وجود شرط کو مستلزم ہے حالانکہ عام طور پر اس آیت سے علم کی فضیلت اس تقریر سے ثابت کی جاتی ہے کہ علم اس لئے ضروری ہے کہ اس سے خشیت پیدا ہوتی ہے جو کہ ضروری ہے اور اب اس کے برعکس یہ تقریر ہوئی کہ علم اس لئے ضروری ہے کہ بدوں اس کے خشیت پیدا نہیں ہوتی تو مشہور تقریر صحیح نہ ہوئی۔

یہ اشکال ذہن میں عرصۂ دراز سے تھا مگر جواب ابھی دس بارہ دن ہوئے ذہن میں آیا ہے۔ نہ معلوم اب تک ذہن میں یہ اشکال کیوں رہا۔ کیا جواب کی طرف التفات نہیں ہوا جواب شافی اب تک نہ ملا تھا۔ بہرحال اب جواب ذہن میں آگیا ہے۔

حاصل جواب کا یہ ہے کہ قرآن کا نزول محاورات کے موافق ہوا ہے۔

---

(۱) شرط نہ پائی جائے تو مشروط بھی نہیں پایا جائے گا (۲) علت پائی جائے تو اس کا حصول ضرور پایا جائے گا (۳) یہ ضروری نہیں کہ اگر علت نہ ہو تو معلول بھی نہ ہو (۴) ایک معلول کے لئے کئی علتیں ہوسکتی ہیں۔

اسالیب معقول پر نہیں ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن سے قضایا عقلیہ کی نفی ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ قضایا عقلیہ سے قضایا نقلیہ کا تعارض جائز نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دلالات قرآنیہ میں محاورات کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اصطلاحات معقول کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ پس یہ ہوسکتا ہے کہ اسلوب معقول سے ایک کلام کی دلالت کسی خاص معنی پر ہو اور اسلوب محاورہ سے دوسرے معنی پر دلالت ہو اور مقصود ثانی ہو نہ کہ اول۔ پس بطریق اسلوب معقول تو وہ اشکال وارد ہوتا ہے مگر بطریق اسالیب محاورات پر یہ اشکال نہیں پڑتا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ گو ظاہر میں اس ترکیب سے خشیت کا مستلزم علم ہونا مستفاد ہوتا ہے نہ کہ علم کا مستلزم خشیت ہونا۔ مگر محاورات میں اس ترکیب سے علم کا مستلزم خشیت ہونا بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر دوسری آیت میں ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا﴾

بدی کو اچھے برتاؤ سے دفع کرو۔ پھر دفعۃً وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی گویا خالص دوست ہوجائے گا اور یہ بات انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صابر ہیں۔

یعنی بدی کا بدلہ بھلائی سے صابرین ہی کرسکتے ہیں۔ یہاں بھی وہی ترکیب جو ﴿اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ''اللہ تعالیٰ سے علم والے ہی ڈرا کرتے ہیں'' میں ہے۔ کیونکہ نفی کے بعد استثناء موجب حصر ہے۔ مگر اس آیت سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ صبر کو اس وصف میں خاص دخل ہے اور یہ کہ صبر ہی سے یہ بات حاصل ہوتی

ہے۔ ورنہ بظاہر اسلوب عقلی کے مطابق تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ صبر کے بدوں یہ بات نصیب نہیں ہوتی۔ گویا صبر اس صفت کے لئے شرط ہے اور وجود شرط وجود مشروط کو مستلزم نہیں۔ تو یہ لازم نہیں کہ جس میں صبر ہو اس میں یہ وصف بھی ہو۔ تو صبر کا اس صفت کو مستلزم ہونا ثابت نہ ہوا۔ مگر محاورات میں اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ صبر کو اس وصف میں خاص دخل ہے۔ چنانچہ ہمارے محاورات میں بھی کہتے ہیں کہ میاں وضو وہی کریگا جو نماز پڑھے گا۔

اس سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وضو کو نماز پڑھنے میں خاص دخل ہے یعنی اگر نماز پڑھنا نہ ہوتا تو وضو ہی کیوں کرتا۔ معلوم ہوتا ہے نماز پڑھے گا۔ حالانکہ وضو شرط ہے علت نہیں ہے۔ پس اسالیب محاورات و اسالیب معقول کا فرق سمجھ لینے کے بعد اب یہ معنی صاف ہیں کہ اس آیت میں محاورات کے اعتبار سے خشیت کو بھی علم کے لئے لازم کہا گیا ہے تو انتفاء لازم سے ملزوم کا انتفاء ہو جاتا ہے تو حاصل یہ ہوا کہ جہاں خشیت نہیں وہاں علم ہی نہیں۔

اب ایک اور عرض ہے کہ اشکال تو رفع ہو گیا مگر جس کو یہ شبہ از خود پیدا ہوا ہو وہ اپنے ذہن کو اس کے سمجھنے کی تکلیف نہ دیں۔ میں نے یہ جواب ان لوگوں کے لئے بیان کیا ہے جن کو یہ اشکال پیش آیا ہو یہ تو علماء کی اصلاح تھی کہ وہ آیت میں علم کو شرط خشیت سمجھ کر بے فکر نہ ہوں کہ وجود علم وجود خشیت کو مستلزم نہیں۔ لہذا علم بدوں خشیت کے بھی ہو سکتا ہے۔ تو گو ہم میں خشیت نہیں مگر پھر بھی عالم ہیں اور علم کے فضائل ہم کو حاصل ہیں۔ بلکہ وہ سمجھ لیں کہ نزول قرآن محاورات پر ہوا ہے اور محاورہ میں اس کی ترکیب سے خشیت کا لازم علم ہونا مفہوم ہوتا ہے۔

اب وہ لوگ رہ گئے جو جاہل ہیں وہ محاورات کے موافق اس آیت سے یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ علم کو خشیت لازم ہے۔ پھر وہ دیکھتے ہیں کہ بعض مواد (۱) میں علم ہے اور خشیت نہیں تو ان کو علم قرآن پر شبہ ہوتا ہے کہ قرآن کا حکم صحیح نہ ہوا۔

اس کا ایک جواب تو اوپر آچکا ہے کہ یہاں علم سے علم تام مراد ہے (جو دل کے اندر اتر جائے۔ محض لفظی علم مراد نہیں کیونکہ وہ مطلوب بالذات نہیں ۱۲)۔

علم کی قسمیں

دوسرا جواب ایک اور ہے وہ بڑے کام کی بات ہے۔ خصوص سالکین کے لئے ہو کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ اور یہی دو قسمیں خشیت میں بھی جاری ہیں۔ ایک عقلی ایک حالی۔ عقلی کو کبھی اعتقادی بھی کہہ دیتے ہیں۔ اور حالی کو طبعی بھی کہا جاتا ہے پس جہاں علم اعتقادی ہے وہاں خشیت بھی اعتقادی ہے۔ اور جہاں علم حالی ہے جس کو کہا تھا۔

علم گر بر دل زنے یارے شود

''علم اگر دل میں اثر کرے وہی معاون و مددگار ہوتا ہے''

وہاں خشیت بھی حالی ہوگی۔ پس اب کوئی مادہ ایسا نہ رہا جس میں علم ہو اور خشیت نہ ہو جن کو آپ اہل علم سمجھ کر خشیت سے خالی دیکھتے ہیں وہ خشیت حالی سے خالی ہیں خشیت اعتقادی سے وہ بھی خالی نہیں۔ پس جیسا علم ان کا اعتقادی ہے ایسی ہی خشیت بھی اعتقادی ہے اور یہاں سے یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ اس آیت میں خشیت کو علماء میں منحصر کیا گیا ہے۔ حالانکہ بہت سے جاہل بھی خدا سے ڈرتے ہیں۔ جواب ظاہر ہے کہ جن کو آپ جاہل سمجھتے ہیں علم اعتقادی سے وہ بھی خالی نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ

(۱) بعض جگہ۔

کے زبردست وقہار ومنتقم ہونے کا اعتقاد ان کو بھی ہے اور یہی علم اعتقادی ہے پھر وہ علم سے خالی کہاں ہوئے۔

اب خشیت اعتقادی کے معنی بھی سمجھ لیجئے۔ خشیت اعتقادیہ کہتے ہیں احتمال مکروہ وہ احتمال عقاب کو۔ سو ایسا کون سا مسلمان ہے جس کو اپنے متعلق احتمال کے درجہ میں یہ خطرہ نہ ہوتا ہو کہ شاید مجھے عذاب ہو۔ سو نفس ایمان کے واسطے اتنا کافی ہے مگر کمال ایمان کے واسطے یہ خشیت کافی نہیں۔ بلکہ اس کے لئے خشیت حالی کی ضرورت ہے جس میں ہر وقت عظمت وجلال خداوندی کا استحضار رہتا ہے جہنم کا عذاب ہر دم پیش نظر رہتا ہے۔

رفع اشکال

اور اسی درجۂ کمال کے متعلق رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن (الصحیح للبخاری ۳:۷۸، ۱:۷: ۱۳۶، ۸:۱۹۵، ۱۹۷)

’’نہیں زنا کرتا زانی جب کہ وہ زنا کرتا ہے کہ مومن ہو یعنی زنا کی حالت میں ایمان نہیں رہتا‘‘

یہاں محض ایمان اعتقادی مراد نہیں جس کے ساتھ اعتقادی خشیت ہوتی ہے۔ بلکہ ایمان کامل مراد ہے جس کے ساتھ خشیت حالی ہوتی ہے اب مخالفین اسلام کا یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن زنا نہیں کرسکتا اور ہم بہت سے مسلمانوں کو زنا کار دیکھتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس میں مومن اعتقادی مراد نہیں بلکہ مومن حالی مراد ہے۔

خلاصہ کلام

غرض اس آیت میں علماء کی بھی اصلاح ہوگئی اور عوام کی بھی اصلاح ہوگئی اور میری تقریر سے سالکین کے شبہات بھی رفع ہو گئے اور مخالفین اسلام کے بھی۔ خلاصہ یہ

ہے کہ دلالت حکمیہ کے اعتبار سے تو اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ علم خشیت کو مستلزم ہے اور دوسری ترکیب سے جس کو دلالت لفظیہ کہنا چاہیئے یہ معنی ہوئے کہ خشیت علم کو مستلزم ہے گویا طرفین سے تلازم ہے اگر کسی میں علم ہے تو ان شاء اللہ علم سے خشیت پیدا ہوجائے گی۔ اور کسی میں خشیت ہے تو وہ خشیت علم کی طرف متوجہ کردے گی تو یہ تلازم ایسا ہوگیا جیسا ایک شاعر نے کہا ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

’’خوش قسمتی ہے کہ اس کا دامن ہاتھ آجائے اور پھر وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہے ہم کھینچ لیں تب بھی‘‘

مقصود دونوں حالتوں میں حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے علم کو مقدم کردیں۔ اور خشیت کو مؤخر، چاہے برعکس۔ اور ایک حقیقت یہاں ایسی ہے کہ اس کے اعتبار سے اگر چاہیں دونوں کو ساتھ کردیں کیونکہ دو چیزوں میں تقدم و تاخر بالذات اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ایک علت ہو اور ایک معلول ہو۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کسی تیسری شے کے معلول ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ دونوں چیزیں معاً موجود ہوتی ہیں۔ تقدم و تاخر باقی نہیں رہتا۔ تو یہاں بھی ایک تیسری شے ایسی ہے جو علم وخشیت دونوں کی علت بن سکتی ہے وہ کیا ہے جذبۂ حق، عنایت حق اگر جذبہ حق متوجہ ہوجائے تو اس صورت میں یہ دونوں ایک دم سے پائے جائیں گے۔ علم بھی اور خشیت بھی۔ تو اب میں ختم کرتا ہوں۔

خشیت کی ضرورت

صرف ایک جزوِ آیت کا رہ گیا ہے اس کے متعلق بھی ایک مختصر بات کہہ دوں کہ اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰـہَ عَـزِیْـزٌ غَـفُـوْرٌ ’’بے شک اللہ تعالیٰ

زبردست بہت بخشنے والے ہیں''

اوپر تو علم کی فضیلت مذکور تھی کہ علماء ہی حق تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ اب اس جملہ میں خشیت کی ضرورت بیان فرماتے ہیں کہ علماء ہی حق تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ حق تعالیٰ سے ڈرنے کی بہت ضرورت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں۔ یہ تو ترہیب تھی آگے ثمرہ خشیت مذکور ہے کہ وہ غفور ہیں۔ اپنے سے ڈرنے والوں کو بخش دیتے ہیں اس میں بتلا دیا کہ خشیت کی اسی لئے بھی ضرورت ہے کہ اس سے مغفرت حاصل ہوتی ہے یہ ترغیب ہے (یا یوں کہا جائے کہ عزیز میں اپنا مالک ضرر ہونا بتلایا ہے اور غفور میں مالک نفع ہونا اور دونوں سے خشیت کی ضرورت یوں ثابت کی ہے کہ حق تعالیٰ سے ڈرنا اس لئے ضروری ہے کہ ضرر و نفع سب ان کے ہاتھ میں ہے کہیں وہ تم کو مضار میں مبتلا اور منافع سے محروم نہ کریں۔

اسی لئے بے فکر نہ رہو۔ (وفیہ ترہیب کما لایخفیٰ ۱۲)(۱)

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم و عمل قویم فرمادیں۔ آمین۔ (۲)

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی اٰلہ واصحابہ اجمعین واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔

---

(۱) اس میں ترغیب وترہیب دونوں باتیں ہیں جو پوشیدہ نہیں ہیں (۲) اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔

خلیل احمد تھانوی

۲۰/اپریل ۲۰۱۳ء